آیت اللہ سید علی خامنہ ای

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد

دار الثقلین

بسم الله الرحمن الرحيم

ہمارے ائمہؑ
اور
سیاسی جدوجہد

از

آیت اللہ سید علی خامنہ ای

ناشر

دارالثقلین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دار الثقلین

ایف ۴۲ — رضویہ سوسائٹی — کراچی ۷۴۶۰۰ — پاکستان

نام کتاب : ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد

تالیف : آیت اللہ سید علی خامنہ ای

ترجمہ : سید ولی الحسن رضوی

نظر ثانی : سید سعید حیدر زیدی

ناشر : دار الثقلین

طبع اول : رجب ۱۴۲۰ھ ، اکتوبر ۱۹۹۹ء

طابع : ایس ، ایم ، پرنٹرز

قیمت [redacted] روپے

فہرست

امام علیؑ نے اپنی جدوجہد کے بارے میں فرمایا :

"پروردگار! تو خوب جانتا ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہم سے (جنگ و پیکار کی صورت میں) ظاہر ہوا اس لئے نہیں تھا کہ ہمیں تسلط اور اقتدار کی خواہش تھی یا مال دنیا کی طلب تھی بلکہ یہ اس لئے تھا کہ ہم دین کے نشانات کو (پھر ان کی جگہ پر) پلٹائیں اور تیرے شہروں میں امن و بہبودی کی صورت پیدا کریں تاکہ تیرے ستم رسیدہ بندوں کو کوئی کھٹکا نہ رہے اور تیرے وہ احکام (پھر سے) جاری ہو جائیں جنہیں معطل کر دیا گیا ہے۔"

(نہج البلاغہ - خطبہ ۱۲۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیؐ کی رحلت کے بعد دین کی ترویج، تبلیغ، تشریح اور حفاظت نیز امت مسلمہ کو گمراہی اور انحراف سے بچاتے ہوئے اخروی کامرانی و کمال کے مقصد کی سمت اس کی رہنمائی کا بار گراں بھی ائمہؑ کے کاندھوں پر ٹھہرا۔

ظاہر ہے یہ فریضہ صرف علمی اور فکری مسائل کی موشگافیوں میں مصروف رہ کے، وعظ و ارشاد کی محافل منعقد کرکے، دنیا سے کنارہ کش ہو کر عبادت و ریاضت میں خود کو مشغول رکھ کے، واضح الفاظ میں عرض کردیں کہ اجتماعی امور اور سیاست عصر سے لاتعلق رہ کر ادا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک طرف تو سیاست لوگوں کے عقائد و افکار، اعمال و کردار پر بہر طور اثر انداز ہوتی ہے اور یہی عوامل انسان اور سماج کی تقدیر کا تعین کرتے ہیں اور دوسری طرف سیاست اور امور ملت کی باگ ڈور ہاتھ میں لئے بغیر اسلامی قوانین کا مکمل طور پر نفاذ و اجراء ناممکن ہے۔ اسی بنا پر ائمہ معصومینؑ کبھی بھی امت کے اجتماعی امور اور سیاسی معاملات سے بے توجہ نہ رہے اور حتیٰ الوسع اس سلسلے میں فعال کردار ادا کیا اور یہی وجہ تھی کہ آپ حضراتؑ ہمیشہ حکام وقت کی آنکھوں کا کانٹا رہے۔

ائمہؑ کی حیات کا یہ پہلو مختلف اسباب کی بنا پر عمومی طور پر پوشیدہ رہا جس کی وجہ سے اور نقصانات کے ساتھ ساتھ یہ نقصان بھی ہوا کہ غلبہ اسلام کی جد وجہد کرنے والی جو تحریکیں اس سلسلے میں سرگرم عمل تھیں وہ ائمہؑ کی اس مثالی روش سے استفادہ نہ کر سکیں۔

ظاہر ہے کہ ائمہؑ کا تحریکی اسلوب ان کے سامنے آیا ہی نہیں جسے وہ اپنے لئے نمونہ عمل قرار دیتے۔ مزید براں ائمہؑ کی اس جد وجہد اور اسکے مقصد و ہدف سے بے خبر رہنے کے نتیجے میں ائمہؑ کے بعد کے دور کے شیعہ خود کو ائمہؑ کی تحریک کا حصہ نہ بنا سکے اور ان کے سامنے ائمہؑ سے وابستگی کے اظہار کا واحد طریقہ ان کے فضائل و مناقب کا بیان اور ان عظیم ہستیوں سے نسبت پر تفاخر رہ گیا۔

زیر نظر مقالہ ایران میں منعقدہ امام رضاؑ سے متعلق دوسری عالمی کانفرنس کے موقع پر رہبر انقلاب اسلامی آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے افتتاحی خطاب سے ماخوذ ہے (البتہ اس محققانہ بحث کی اہمیت کے پیش نظر موصوف نے طباعت سے قبل نظر ثانی کے دوران حسب ضرورت اس میں اضافہ اور تشریح فرمادی ہے)۔ اس مقالہ میں گو کہ ائمہؑ کی سیاسی جد وجہد اور اسکے اسلوب و انداز کا نہایت اجمال کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اسکے باوجود نہایت فکر انگیز نکات پر مشتمل ہے' بالخصوص مقالہ کے آخر میں جن قابل بحث نکات کو پیش کیا گیا ہے وہ یقیناً افکار کو جھنجھوڑنے والے اور اس موضوع پر تحقیق و جستجو پر آمادہ کرنے والے ہیں۔

امید ہے قارئین کرام مستفید ہوں گے اور اپنی گراں قدر آراء سے آگاہ فرمائیں گے۔

سکریٹری نشرواشاعت
دارالثقلین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد

خدا کا ہزار شکر کہ اس عظیم اجتماع میں میری ایک دیرینہ آرزو پوری ہو رہی ہے۔ ائمہ علیہم السلام کی مظلومیت ان بزرگانِ اسلام کی زندگیوں تک محدود نہیں رہی' بلکہ آج سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود ان حضرات کی سیرت کا ایک اہم ترین بلکہ اصلی ترین رخ لوگوں کی عدم توجہی کا شکار ہے جس نے ائمہؑ کی مظلومیت کو جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ یقیناً گزشتہ صدیوں میں ائمہؑ کے بارے میں بڑی ہی بے مثال اور قیمتی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ ان پاک اور بزرگ ہستیوں کی زندگیوں سے متعلق تمام روایات مختلف مجموعوں کی شکل میں آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے جمع کی جا سکی ہیں۔ لیکن ائمہؑ کی سیاسی جدوجہد کے نقوش' جو ان بزرگوں کی تقریباً دو سو پچاس سال کی ظاہری زندگی کے اہم ترین اور ممتاز ترین پہلو ہیں' ان بے شمار احادیث و روایات کے انبار اور ائمہؑ کی حیات کے علمی و معنوی پہلوؤں کو اجاگر کرنے والی سوانح حیات میں تقریباً گم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔

ائمہؑ کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کا عنصر

ائمہ علیہم السلام کی زندگی کو ہمیں درس حیات اور اسوۂ عمل کے طور پر دیکھنا چاہئے' یہ

مناسب نہیں کہ ہم صرف ایک شاندار قابل فخر یادگار کے عنوان سے اس کا مطالعہ کریں۔ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان عظیم ہستیوں کی سیاسی روش اور ان کے طریقۂ کار پر بھی توجہ دیں۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے مجھے ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے اس رخ نے خاص طور پر متاثر کیا ہے اور میں اس حقیقت کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ میرے ذہن میں یہ خیال ۱۹۷۱ء کے سخت ترین امتحان و آلام کے ایام میں پیدا ہوا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی اعلائے کلمۂ توحید اور استقرار حکومت الٰہی کے سلسلہ میں ائمہؑ کا مجاہدانہ کردار اور ان کی قربانیاں وفداکاریاں میرے پیش نظر تھیں۔ پھر بھی وہ نکتہ جو اس دور میں ناگہانی طور پر میرے ذہن میں روشن ہوا وہ یہ تھا کہ ان بزرگواروں کی زندگی (اس ظاہری تفاوت کے باوجود جس کو دیکھ کر بعض لوگوں نے ان کے کردار میں تضاد کا گمان کیا ہے) دراصل مجموعی طور پر ایک مسلسل طولانی تحریک ہے جو ۱۱ھ سے شروع ہو کر دو سو پچاس سال تک مسلسل جاری رہی اور ۲۶۰ھ میں جو غیبت صغریٰ کے شروع ہونے کا سال ہے ختم ہوئی۔ یہ تمام ہستیاں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں' ایک ہی شخصیت ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ ان سب کا راستہ اور مقصد ایک ہی ہے۔ پس امام حسن مجتبیٰؑ' امام حسین سید الشہداءؑ اور امام سجاد زین العابدینؑ کی زندگیوں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے اور پھر لامحالہ اس خطرناک غلط فہمی کا شکار ہو جانے کی بجائے کہ ان تینوں ائمہؑ کی زندگیوں کا بظاہر باہمی فرق ان میں ٹکراؤ اور تضاد کی نشاندہی کرتا ہے ہمیں چاہئے کہ ان سب کی زندگیوں کو ملا کر ایک ایسے انسان کی زندگی فرض کریں جس نے دو سو پچاس سال کی عمر پائی ہو اور جو ۱۱ھ سے لے کر ۲۶۰ھ تک ایک ہی منزل کی سمت مسلسل طور پر گامزن رہا ہو۔ اس طرح اس عظیم اور معصوم زندگی کا ایک ایک عمل قابل فہم اور لائق توجیہ ہو جائے گا۔

ہر وہ انسان جو عقل و حکمت سے مالامال ہو گا' چاہے وہ معصوم نہ بھی ہو' جب وہ اتنی طویل مدت طے کرے گا تو حتمی طور پر وقت اور حالات کے تحت مناسب حکمت عملی اختیار کرے گا۔ ممکن ہے وہ کبھی تیز رفتاری کو ضروری سمجھے اور شاید کبھی سست رفتاری میں

مصلحت جانے، حتیٰ ممکن ہے کبھی وہ کسی حکیمانہ تقاضے کے تحت پسپائی بھی اختیار کرے۔ ظاہر ہے وہ لوگ جو اس کے علم و حکمت اور ہدف و مقصد کے بارے میں علم رکھتے ہیں اس کی عقب نشینی کو بھی پیش قدمی شمار کریں گے۔ اس نکتہ نظر سے امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کی زندگی امام حسن مجتبیٰؑ کی زندگی کے ساتھ اور ان کی زندگی سید الشہداء امام حسینؑ کی زندگی کے ساتھ اور آپؑ کی زندگی دیگر آٹھ ائمہ کی زندگیوں کے ساتھ ۲۶۰ھ تک ایک مسلسل تحریک کہی جا سکتی ہے۔

یہ وہ خیال تھا جس کی طرف میں اس سال متوجہ ہوا اور پھر اسی نکتہ نظر کے ہمراہ میں نے ان عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ شروع کیا اور جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا میری اس فکر کو تائید حاصل ہوتی گئی۔

البتہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ایک نشست میں ممکن نہیں ہے لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ پیغمبر اسلامؐ کی ذریت طاہرہ یعنی ائمہ معصومینؑ کی پوری زندگی ایک خاص سیاسی موقف کے ہمراہ رہی ہے، بنابرایں یہ اس قابل ہے کہ اس (سیاسی موقف) کو جداگانہ طور پر مستقل عنوان کی حیثیت سے زیر بحث لایا جائے۔ لہٰذا میں یہاں اس سلسلہ میں مختصر طور پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں گزشتہ سال اپنے پیغام میں ائمہ طاہرینؑ کی زندگی میں گرم جد و جہد کی طرف اشارہ کر چکا ہوں، آج ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

پہلی چیز یہ عرض کرنا ہے کہ سیاسی جد و جہد یا گرم سیاسی جد و جہد جسے ہم ائمہؑ کی جانب منسوب کر رہے ہیں اس سے ہماری مراد کیا ہے؟

مراد یہ ہے کہ ائمہؑ کی مجاہدانہ کوششیں محض ایسی علمی، اعتقادی اور کلامی نہ تھیں جس طرح کی کلامی تحریکوں کی مثالیں اس دور کی تاریخ اسلام میں ملتی ہیں جیسے معتزلہ و اشاعرہ وغیرہ کی تحریکیں۔ ائمہؑ کی علمی نشستیں، درسی حلقے، بیانِ حدیث و نقل معارف اسلامی اور احکام فقہی کی تشریح و توضیح وغیرہ فقط اس لئے نہ تھے کہ علم فقہ یا علم کلام سے متعلق اپنے مکتب فکر کی حقانیت ثابت کر دی جائے بلکہ ائمہؑ کے مقاصد اس سے کہیں بلند تھے۔

اسی طرح یہ اس قسم کا مسلحانہ قیام بھی نہ تھا جیسا کہ جناب زید شہید اور ان کے بعد ان کے ورثا یا بنی الحسنؑ اور بعض آل جعفرؑ نیز اسی قبیل کے دوسرے افراد کے یہاں ائمہ علیہم السلام کی حیات کے دوران نظر آتا ہے۔ حضرات ائمہؑ نے اس قسم کا کوئی مبارزہ نہیں کیا۔ البتہ اسی مقام پر یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے (اگر ممکن ہوا تو بعد میں تفصیل پیش کروں گا) کہ ائمہ معصومینؑ نے قیام کرنے والے ان تمام لوگوں کی بطور مطلق مخالفت بھی نہیں کی، اگرچہ بعض کی مخالفت بھی کی ہے۔ البتہ اس مخالفت کا سبب ان کا مسلحانہ قیام کرنا نہیں تھا بلکہ کچھ اور دوسری وجوہات تھیں۔ بعض کی بھرپور تائید بھی کی ہے بلکہ بعض میں پشت پناہی اور مدد کے ذریعہ شرکت بھی کی ہے۔ اس سلسلہ میں امام جعفر صادقؑ کی یہ حدیث قابل توجہ ہے، آپؑ فرماتے ہیں :

"لوددت ان الخارجی یخرج من آل محمد و علی نفقه عیاله"

"مجھے یہ پسند ہے کہ آلِ محمدؐ و علیؑ میں سے کوئی خروج کرنے والا قیام کرے اور میں اس کے اہل و عیال کے اخراجات کا کفیل بنوں۔"

اس (کفالت و ذمہ داری) میں مالی امداد، آبرو کی حفاظت، مخفی جائے تحفظ مہیا کرنا یا اسی طرح کی دوسری مدد بھی شامل ہے۔ لیکن جہاں تک میری نظر جاتی ہے، ائمہؑ نے بہ نفس نفیس خود امام وقت کی حیثیت سے مسلحانہ قیام میں کبھی شرکت نہیں کی۔

چنانچہ ائمہ علیہم السلام کی گرم سیاسی جد و جہد سے مراد نہ تو وہ مذکورہ پہلی علمی مبارزہ کی صورت ہے اور نہ ہی یہ دوسری نوعیت کا مسلحانہ قیام بلکہ اس سے مراد ایک سیاسی ہدف اور مقصد کے تحت جد و جہد ہے۔

وہ سیاسی ہدف اور مقصد کیا ہے؟

وہ سیاسی مقصد "حکومت اسلامی کی تشکیل" ہے جس کو ہم اپنی زبان میں حکومت علوی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد سے ۲۶۰ھ تک ہم دیکھتے ہیں کہ مسلسل طور پر ائمہؑ کی یہی

کوشش رہی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایک الٰہی حکومت قائم کریں اور آپ حضرات کا یہی بنیادی مدعا تھا۔ البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود اپنے ہی دور میں (یعنی ہر امام اپنے اپنے دور میں) اسلامی حکومت قائم کر دینا چاہتا تھا۔ ممکن ہے یہ جد و جہد مستقبل قریب، مستقبل بعید حتیٰ کہ بعض حالات میں آئندہ انتہائی نزدیکی زمانے میں حکومتِ اسلامی کے قیام سے متعلق رہی ہو۔ مثلاً امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں کی جانے والی کوششیں آئندہ کم سے کم مدت میں اسلامی حکومت کے قیام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ چنانچہ جب مسیب ابن نجبہ اور اسی قبیل کے دوسرے افراد نے امامؑ سے سوال کیا کہ آپؑ نے کیوں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے؟ تو ان کے جواب میں امامؑ نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ اسی طرف اشارہ ہے، امامؑ فرماتے ہیں :

"ماندری لعلہ فتنۃ لکم و متاع الی حین"

"نہیں معلوم شاید یہ تمہارا امتحان ہو اور ایک وقت تک کا سامان۔"

میری نظر میں جناب سیدِ سجادؑ کے دور میں یہ کوششیں، مستقبل قریب کے لئے تھیں جس کے لئے ثبوت و شواہد موجود ہیں جو آئندہ پیش کئے جائیں گے۔ امام محمد باقرؑ کے دور میں اس بات کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ نزدیک ترین مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کی گئی۔ البتہ امام ہشتم (امام علی رضاؑ) کی شہادت کے بعد کی جانے والی کوششوں کے سلسلہ میں اس بات کا گمان ہے کہ یہ کوششیں مستقبل بعید کے لئے رہی ہوں۔

مختصر یہ کہ یہ حکومت کب قائم ہو، اس اعتبار سے ہر امامؑ کی جد و جہد کا طریقۂ کار مختلف ہو سکتا ہے لیکن یہ طے ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کوششیں ہمیشہ جاری رہی ہیں۔

ائمہ علیہم السلام کی تمام سرگرمیاں (سوائے ان روحی و معنوی امور کے جو ایک بندہ اپنے خدا سے قربت اور عرفانی مراحل کی تکمیل کے سلسلہ میں انجام دیتا ہے) یعنی درس و تدریس، حدیث و علم کلام کی موشگافیاں، مخالفین سے علمی و سیاسی مناظرے، مختلف گروہوں کی حمایت یا مخالفت وغیرہ، سب کچھ اسی مقصد کے لئے تھیں کہ ایک اسلامی حکومت قائم کی جا سکے۔

یہ ہمارا دعویٰ ہے' البتہ اس موضوع پر لوگوں کے درمیان اختلاف نظر رہا ہے اور رہے گا اور ہمیں بھی اس پر اصرار نہیں ہے کہ ہر شخص ہماری فکر اور نظریہ کو آنکھ بند کر کے قبول کرے۔ بلکہ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس پہلو پر پوری توجہ اور دقت کی جائے اور ائمہؑ کی زندگی پر اس زاویہ سے تجدید نظر ضرور کی جائے۔

ادھر چند برسوں میں میری تحقیق و جستجو اس محور پر رہی ہے کہ چاہے مجموعی طور پر تمام ائمہ علیہم السلام کے بارے میں اور خواہ انفرادی طور پر علیحدہ علیحدہ ان حضرات کے سلسلہ میں اس موضوع کو قابل قبول دلائل سے ثابت کیا جائے البتہ اس سلسلہ میں بعض دلیلیں کلی نوعیت کی ہیں' مثال کے طور پر :

☆ ہمیں معلوم ہے کہ امامت سلسلہ نبوت کی ہی ایک تکمیلی کڑی ہے اور نبیؐ کا از اول امام ہونا ثابت ہے جیسا کہ امام جعفر صادقؑ کے اس قول سے بھی ظاہر ہے : "ان رسول اللہ کان ھو الامام" (اور رسول اللہؐ ہی امام تھے) نیز رسول صلعم نے حق و عدالت پر مبنی ایک الٰہی نظام قائم کرنے کے لئے ہی قیام فرمایا تھا اور ایک عرصہ تک اپنی انتھک جد و جہد کے بعد اس طرح کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے' جس کی آپؐ تا حیات حفاظت بھی کرتے رہے۔ لہٰذا امام جو نبیؐ کا جانشین ہے ایک ایسے نظام سے ہرگز غفلت نہیں برت سکتا۔

یہ ایک کلی استدلال ہے البتہ اس ذیل میں بحث و گفتگو اور مختلف نکات پر غور و خوض کے ذریعہ تحقیق کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے کے بعض دلائل خود ائمہؑ کے کلمات سے ماخوذ ہیں' یا ان حضراتؑ کے طرز حیات سے اخذ کئے جا سکتے ہیں جو اس نکتہ کی جانب توجہ اور اس نکتہ پر زیرکی کے ساتھ غور و فکر سے سمجھے جا سکتے ہیں' اور در حقیقت ایک خاص زمانہ کے حالات و شرائط اس دور میں ائمہؑ کے موقف اور مقام کو سمجھنے میں مددگار ہو سکتے ہیں جیسے کہ اس زمانہ (شاہ کے دور) میں ہمارے لئے یہ کیفیت حاصل تھی۔ مثلاً ایک انسان تاریک قید خانے میں پہنچ کر ہی "السلام علی المعذب فی قعر السجون و ظلم المطامیر ذی الساق

المرضوض بحلق القيود" (سلام ہو ان پر جو گہرے زندانوں میں رکھے گئے اور قید خانوں میں ظلم کا شکار رہے اور تاریک زندانوں میں ان کے پائے مبارک زنجیر کے حلقہ میں مجروح رہے۔ اقتباس از زیارتِ امام موسیٰ کاظمؑ) جیسے جملے کا مفہوم اور علت و وجہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ بہرحال اسی پہلو پر ہم کسی قدر بحث کا ارادہ رکھتے ہیں اور اپنے افکار و خیالات اس عظیم الشان اجتماع کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

☆ جو حضرات دوسری صدی ہجری کی سیاسی تاریخ پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور جنہوں نے ۱۰۰ھ سے کچھ قبل سے لے کر ۱۳۲ھ (جس میں بنی عباس کی حکومت کا آغاز ہوا) تک بنی عباس کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ ائمہ علیہم السلام کی بھرپور سیاسی جد و جہد کو کسی حد تک اس وقت کی بنی عباس کی سیاسی زندگی سے تشبیہ دے سکتے ہیں (لیکن جس نے بنی عباس کی زندگی' ان کی سیاسی جد و جہد اور ان کی دعوتوں کا قاعدہ سے مطالعہ نہیں کیا ہے اس کے لئے یہ تشبیہ ہرگز قابل فہم و رسا نہیں ہو سکتی) انہی کی طرح کے حالات ائمہؑ کی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں البتہ اس جوہری فرق کے ساتھ جو ائمہؑ کے مقصد اور بنی عباس کے مقصد' ائمہؑ کی روش اور بنی عباس کی روش' ائمہؑ کے کردار اور بنی عباس کے کردار کے درمیان پایا جاتا ہے۔ البتہ شکل اور طریقۂ کار کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے بہت نزدیک نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر ہمیں یہ دونوں راہیں ایک دوسرے میں مخلوط نظر آتی ہیں۔ خود بنی عباس آلِ علیؑ کے ساتھ اپنے طریقۂ کار' تبلیغات و نعرہ و دعوت کی یکسانیت و قربت کی وجہ سے عراق و حجاز سے دور علاقوں میں ایسا ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ آلِ علیؑ کی راہ پر ہی کاربند ہیں۔ حتیٰ مسودہ نے جب خراسان و رے میں بنی عباس کی تحریک کی داغ بیل ڈالتے ہوئے سیاہ لباس زیب تن کئے تو اس کے بارے میں کہا کہ :

"هذا السواد ' حداد آل محمد و شهداء كربلا و زيد و يحيى"

"یہ سیاہ لباس شہدائے کربلا اور زید و یحییٰ کے سوگ کی علامت ہے۔"

اور بعض لوگ (حتیٰ ان کے کچھ سرکردہ لوگ) بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ آل علیؑ کے لئے

کام کر رہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ میں بھی نظر آتی ہے البتہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں' تین بنیادی عناصر مقصد' روش اور کردار کے فرق کے ساتھ۔

ائمہؑ کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کا یہی مطلب ہے۔

ائمہؑ کی سیاسی تحریک کی کلی تصویر

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ائمہؑ کے سیاسی جہاد اور جدوجہد کی کلی تصویر کشی کر دی جائے۔ پھر اس کے بعد ان عظیم ہستیوں کی زندگی سے ان کی سیاسی جدوجہد کے چند روشن نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔

اس کلی تصویر کے سلسلہ میں ہم فی الحال پہلے تین ائمہؑ یعنی امیرالمومنینؑ' حسن مجتبیٰؑ اور سید الشہداءؑ کی زندگیوں کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے کیونکہ ان کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ تقریباً کسی کو بھی اس بارے میں شبہ نہیں کہ ان حضرات کی تحریک میں سیاسی پہلو موجود تھا۔ چنانچہ ہم اپنی بحث جناب سید سجاد علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں۔

میری نظر میں امام زین العابدین علیہ السلام کے دور یعنی ۶۱ھ سے لے کر امام حسن عسکریؑ کی شہادت یعنی ۲۶۰ھ تک دو سو سال کا عرصہ تین سیاسی مرحلوں پر مشتمل ہے۔

پہلا مرحلہ ۶۱ھ سے ۱۳۵ھ یعنی منصور دوانیقی کی خلافت کے آغاز تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مرحلہ میں سیاسی جدوجہد ایک نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے' گہرائی حاصل کرتی' وسعت پیدا کرتی ہے اور ۱۳۵ھ تک اوج پر پہنچ جاتی ہے۔ ۱۳۵ھ جو سفاح کی موت اور منصور دوانیقی کی خلافت کا سال ہے' صورتحال بدلتی ہے اور ایسی مشکلات سامنے آتی ہیں جو بڑی حد تک اس جدوجہد کی پیشرفت روک دیتی ہیں۔ ظاہر ہے ایک سیاسی تحریک میں ایسی چیزیں پیش آیا ہی کرتی ہیں' خود اپنی تحریک کے دوران ہم نے ایسی چیزوں کا مشاہدہ کیا ہے۔

دوسرا مرحلہ ۱۳۵ھ سے ۲۰۲ھ یا ۲۰۳ھ تک کا ہے جو امام رضا علیہ السلام کی شہادت کا سال ہے۔ یہ مرحلہ پہلے مرحلہ کی بہ نسبت جد وجہد کے اعتبار سے ایک درجہ بالاتر، عمیق تر اور وسیع تر نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس مرحلہ کا آغاز سخت مشکلات کے ہمراہ ہوا تھا پھر بھی تحریک نے رفتہ رفتہ اوج حاصل کر لیا، پھیلی اور قدم قدم کامیابیوں سے قریب تر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ امام علی رضا علیہ السلام کی شہادت کے بعد اس جد و جہد میں پھر توقف پیدا ہو گیا۔

۲۰۴ھ میں مامون رشید کے بغداد چلے جانے کے بعد اسلامی جد و جہد کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے (تیسرا مرحلہ)۔ دراصل مامون کی خلافت کے ابتدائی دن ائمہ علیہم السلام کی زندگی کے نہایت دشوار اور آزمائش و ابتلا کے دن ہیں، اگرچہ اس دور میں تشیع ہمیشہ سے زیادہ پھیلا۔ میری نظر میں اس عصر میں ائمہ علیہم السلام کو ہر دور سے زیادہ مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا اور یہ وہی زمانہ ہے جب میرے خیال میں ائمہؑ کی جد و جہد ایک طویل مدتی ہدف کے لئے تھی۔ یعنی اب ائمہؑ کو غیبت صغریٰ سے قبل الٰہی حکومت کے قیام کی امید نہیں رہی تھی۔ ان کی کوششیں مستقبل بعید کے لئے زمین ہموار کرنے کی طرف منتقل ہو چکی تھیں۔ اور یہ سلسلہ ۲۰۴ھ سے یوں ہی جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکریؑ کی شہادت اور غیبتِ صغریٰ کی ابتداء ہو جاتی ہے۔

یہ تینوں ادوار کچھ امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں جنہیں اجمالی طور پر بیان کروں گا۔

پہلا دور

یہ پہلا دور امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی زندگی کے ایک حصے پر مشتمل ہے۔ اس دور کا آغاز بے پناہ دشواریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کربلا کے حادثہ نے دنیائے تشیع بلکہ پورے عالمِ اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ قتل و قید و ظلم و ستم کوئی نئی بات نہ تھی لیکن خاندان نبوت کی شہادت اور پھر مخدرات عصمت و طہارت کی اسیری، ان کی شہر بہ شہر

تشہیر، فرزندِ زہراؑ کے کٹے سر کا نیزے پر بلند کیا جانا (جبکہ ابھی وہ لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے ان لب ہائے مبارک پر پیغمبر اسلامؐ کو بوسے لیتے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا) وہ چیزیں تھیں کہ جنہیں دیکھ کر پورا عالم اسلام مبہوت و متحیر تھا۔ کسی کے تصور میں بھی نہ تھا کہ حالات یہ رخ اختیار کرلیں گے۔ اگر جناب زینب سلام اللہ علیہا سے منسوب یہ شعر درست ہو کہ ؎

"ماتوهمت یاشقیق فوادی　　کان هذا مقدراً مکتوبا"

تو دراصل یہ اسی ناقابل تصور درد و کرب کا اظہار ہے اور یہی احساسات تمام لوگوں کے تھے۔ یکایک ذہنوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ موجودہ سیاست ایک دوسری قسم کی سیاست ہے۔ یہ ظلم و زیادتی اب تک ہونے والی زیادتیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ ناقابل تصور چیزیں تصور کی جانے لگیں اور وقوع پذیر ہونے لگیں۔ چنانچہ تمام دنیائے اسلام پر ایک عجیب قسم کی دہشت اور رعب کا عالم طاری تھا۔ صرف کوفہ میں توابین اور پھر مختار کی برکت سے فضاء کچھ مختلف تھی۔

مدینہ منورہ نیز دیگر مقامات پر واقعہ کربلا کے اثر سے ایسا شدید قسم کا رعب مسلط تھا حتیٰ مکہ مکرمہ میں بھی جہاں کچھ دنوں بعد عبداللہ بن زبیر نے آواز اٹھائی ایسی کیفیت طاری تھی کہ تاریخ اسلام میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

عراق میں بھی اگرچہ ۶۴ھ ۶۵ ہجری میں (کیونکہ بظاہر توابین کو ۶۵ھ میں شہید کیا گیا) توابین کی کوششوں سے وہاں کی مردہ اور بوجھل فضا میں ایک تازہ لہر پیدا ہوئی لیکن توابین کی شہادت نے اس خوف و وحشت میں اور اضافہ کر دیا اور پھر جب اموی کارخانہ سیاست کے دشمن یعنی مختار اور مصعب ابن زبیر آپس میں لڑ پڑے اور عبداللہ ابن زبیر کو مکہ میں رہنے کے باوجود بھی اہلِ بیتؑ کے طرفدار جناب مختار کا وجود کوفہ میں برداشت نہ ہوا اور مصعب ابن زبیر کے ہاتھوں مختار قتل کر دیئے گئے تو ایک مرتبہ پھر اس خوف و وحشت میں مزید اضافہ ہوا اور امیدیں، مایوسی میں بدلنے لگیں اور آخر کار عبدالملک بن مروان کو تخت خلافت پر تسلط حاصل ہوا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں پوری دنیائے اسلام پر بنی امیہ کی گرفت

مضبوط ہو گئی اور اکیس سال تک پورے قدرت و اقتدار کے ساتھ وہ مسلمانوں پر حاکم رہے۔

واقعہ حرہ

اس مقام پر خاص طور سے واقعہ حرہ کی طرف اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۶۴ھ میں جبکہ مدینہ رسولؐ پر مسلم بن عقبہ نے چڑھائی کی جو مزید رعب و وحشت پیدا کرنے کا سبب ہوئی اور جس نے اہل بیتؑ کو مکمل طور پر غربت و مظلومیت میں مبتلا کر دیا۔ اس حادثہ کی مختصر روئیداد یہ ہے کہ ۶۳ھ میں یزید نے شامی سرداروں میں سے ایک ناتجربہ کار جوان کو مدینہ میں مقرر کیا جس نے اہل مدینہ کے خیالات یزید کی طرف سے صاف کرنے کے لئے چند افراد کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ شام جا کر یزید سے ملاقات کریں۔ چنانچہ کچھ لوگ اس پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے شام جا کر یزید سے ملاقات بھی کی۔ اگرچہ یزید نے ان کو بہت زیادہ انعامات (پچاس ہزار سے ایک لاکھ درہم تک) سے نوازا لیکن یہ لوگ جو خود صحابی رسول تھے یا اولاد صحابہ میں سے تھے یزیدی دربار کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اور زیادہ متنفر اور غصہ ہو گئے اور جب مدینہ واپس ہوئے تو عبداللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ نے اپنی حکومت کا اعلان کر کے یزید کے خلاف بغاوت اور مرکزی حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یزید نے ان کی سرکوبی کے لئے مسلم ابن عقبہ کو روانہ کیا اور مدینہ رسولؐ میں ایسا عظیم المیہ برپا ہوا جس نے تاریخ میں خون کے آنسو رلا دینے والے، سسکیوں اور آہوں سے معمور باب کا اضافہ کر دیا۔

یہ واقعہ بھی لوگوں میں شدید رعب و وحشت ایجاد کرنے کا سبب بنا۔

فکری انحطاط

اس خوف و ہراس کے ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرا عامل بھی موجود تھا، اور وہ تھا پوری

دنیائے اسلام پر چھایا ہوا فکری انحطاط، جو گزشتہ بیس برسوں میں دینی تعلیمات سے بے اعتنائی کا نتیجہ تھا۔ گویا ۴۰ھ کے بعد تقریباً بیس سال کے عرصہ میں دین و ایمان کی تعلیمات، آیات الہی کی تفسیر اور پیغمبر اسلامؐ کے حق و آگہی سے بھرپور بیانات اس حد تک محدود ہو کر رہ گئے تھے کہ عوام الناس اعتقاد و ایمان کے لحاظ سے بالکل فرومایہ، کھوکھلے اور دیوالیہ ہو چکے تھے۔

جب ایک انسان اس دور کی عوامی زندگی کا ذرا باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیتا ہے اور مختلف تاریخوں اور روایات میں ان کے حالات کھنگالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی معاشرے میں علماء و قارئین اور محدثین و مقدسین بالکل ناپید ہو چکے تھے (ان کے بارے میں گفتگو بعد میں آئے گی) ایسا نہ تھا، پھر بھی عوامی زندگی بلاشبہ بے دینی اور اعتقادی ضعف اور اضمحلال کا شکار تھی۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ خود دربار خلافت سے تعلق رکھنے والے بعض افراد نبوت کے بارے میں بھی شکوک و شبہات اور ابہامات پیدا کرنے لگے تھے۔ چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ خالد بن عبداللہ قسری جس کو بنی امیہ کی پستی اور رذالت کا بدترین نمونہ کہا جا سکتا ہے بڑی ہی دیدہ دلیری کے ساتھ کہتا ہے: "کان یفضل الخلافة علیٰ النبوة" یعنی "(معاذ اللہ) خلافت نبوت سے بالاتر ہے۔" اور اس کے لئے دلیل کے طور پر کہتا تھا کہ: "ایهما افضل؟ خلیفة الرجل فی اهله اورسوله الیٰ صحابه" (اگر تم ایک شخص کو اپنے گھرانے میں اپنا جانشین مقرر کرتے ہو تو وہ شخص تم سے زیادہ قریب ہو گا یا وہ شخص جس کو کسی کے پاس پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا جائے۔)

ظاہر ہے جس کو تم اپنے گھرانے میں منتخب کر کے اپنا جانشین مقرر کرتے ہو وہی تم سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفۃ اللہ (یہ لوگ خلفاء کو خلیفۂ رسول کے بجائے خلیفۃ اللہ کہنے لگے تھے) رسول اللہ سے بالاتر ہے۔

یہ تو خالد بن عبداللہ قسری کی بات تھی یقیناً اس طرح کی باتیں دوسرے افراد بھی کرتے رہے ہوں گے۔

جب میں نے بنی امیہ اور بنی عباس کے دور کے شعراء کے یہاں تلاش کرنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے خلفاء کے لئے خلیفہ اللہ کی تعبیر اس کثرت سے استعمال کی جانے لگی کہ عوام یہ بھی بھول گئے کہ خلیفہ 'خلیفہ پیغمبر بھی ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ بنی عباس کے دور میں بھی جاری رہا چنانچہ بشار ابن برد نے جب یعقوب بن ابن داؤد اور منصور کی ہجو میں اشعار کہے تو اس میں بھی یہی تعبیر استعمال کی:

"ضاعت خلافتکم یا قوم فالتمسوا
خلیفه الله بین الزق و العود"

"اے قوم تمہاری خلافت ختم ہو گئی اب خلیفہ الٰہی کو زق اور عود کے درمیان تلاش کرو۔"

سوچنے کا مقام ہے جب ایک شاعر خلیفہ کے لئے ہجو کہتا ہے تو بھی خلیفہ اللہ کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس زمانہ کے تمام نامور شعراء جریر' فرزدق' نصیب اور سینکڑوں دوسرے مشہور شعراء جب خلیفہ کی مدح سرائی کرتے ہیں تو اس کو خلیفہ اللہ سے مخاطب کرتے ہیں۔

یہ اس زمانے کے لوگوں کے اعتقاد کا صرف ایک نمونہ ہے۔ دین کی بنیادی باتوں کے سلسلہ میں بھی اس حد تک ایمان کمزور ہو چکا تھا۔

لوگوں کے اخلاق و عادات کی حالت تو اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ ابوالفرج کی کتاب اغانی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ یہ میرے ہاتھ آیا کہ تقریباً اسی اور نوے ہجری سے ۵۰' ۶۰ سال بعد تک جتنے بڑے بڑے گانے بجانے والے عیاش اور عشرت طلب افراد تھے وہ یا تو مدینہ سے تعلق رکھتے تھے یا مکہ سے۔ چنانچہ جب شام میں خلیفہ کا دل اکتا جاتا تھا' محفل رقص و سرور گرم کرنے کے خواہش مچلنے لگتی تھی اور بہترین قسم کے گانے بجانے والوں کو سننے کا دل چاہتا تھا تو اس کے لئے مکہ یا مدینہ سے کسی کو لایا جاتا تھا' جو اس وقت کے مشہور و معروف گانے بجانے والے مغنیوں اور طبلہ نوازوں کے مرکز تھے۔ بدترین فحاشی اور ہرزہ سرائی کرنے والے شعراء مکہ اور مدینہ میں موجود تھے۔

مرکز وحی والہام اور منبع ایمان و اسلام مرکز فحشاء و فساد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہمیں مکہ

مدینہ کے بارے میں ان تلخ حقائق کو بھی جاننا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ائمہؑ کے متعلق کتب و آثار میں ان تلخ حقیقتوں کے بیان سے چشم پوشی کی گئی ہے۔

مکہ میں عمر ابن ابی ربیعہ نامی ایک شاعر تھا جس کا شمار بدترین عریاں و فحش نگاروں میں ہوتا تھا۔ البتہ شک نہیں کہ فن و شاعری میں اس کو پوری قدرت و کمال حاصل تھا۔ اس کی داستان اور اس قسم کے دوسرے شعراء کا کردار اس زمانے کی غم انگیز تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے اور خود مقامات طواف و رمی جمرات نیز دیگر مشاہد مقدسہ ان لوگوں کی بیہودہ گوئی اور فسق و فجور کے شاہد ہیں۔ "مغنی" میں موجود درج ذیل اشعار اسی دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہیں :

بدالی منها معصم حین جمرت
وکف خضیب زینت ببنان
فواللّٰه مادری وان کنت داریا
بسبع رمین الجمرام بثمان

"جب اس نے رمی جمرہ کیا تو میرے سامنے اسکی کلائی اور مہندی لگے ہاتھ ظاہر ہوئے جن کی انگلیوں کے پوروں کی زینت کی گئی تھی۔ بخدا انہیں دیکھ کر میں بھول گیا کہ میں نے سات کنکر مارے ہیں یا آٹھ جبکہ اس سے پہلے مجھے یاد تھا۔"

ایک راوی کے الفاظ ہیں کہ جس وقت عمر ابن ابی ربیعہ مرا ہے تو پورے مدینہ میں صف ماتم بچھ گئی۔ مدینہ کی گلیوں اور کوچوں سے لوگوں کے رونے اور فریاد کرنے کی آوازیں بلند تھیں۔ جس طرف سے گزرئیے نوجوانوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں حلقہ بنائے عمر ابن ابی ربیعہ کی موت پر رنج و غم میں بیٹھی نظر آتی تھیں۔ میں نے ایک کنیز کو دیکھا کہ کسی کام سے چلی جا رہی ہے اور اس حالت میں بھی اس کی آنکھوں سے اشک جاری ہیں۔ گریہ و زاری کرتی ہوئی وہ کنیز جب کچھ نوجوانوں کے قریب سے گزری تو انھوں نے سوال کیا : کیوں اس قدر روتی ہو؟ کنیز نے جواب دیا : عمر ابنِ ابی ربیعہ جیسے شخص سے محروم ہو جانے پر۔ کسی نے جواب دیا : غم نہ کرو مکہ میں ایک دوسرا شاعر حارث ابن خالد مخزومی موجود ہے اور وہ بھی

عمر ابن ابی ربیعہ کی طرح شعر کہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے حارث کا ایک شعر سنایا جس کو سن کر کنیز نے اپنی آنکھوں کو خشک کرتے ہوئے کہا : الحمد للہ الذی لم یخل حرمہ (خدا کا شکر کہ اس نے اپنا حرم خالی نہیں چھوڑا!!)۔

یہ تھی اہل مدینہ کی اخلاقی حالت۔ اس طرح کی بے شمار داستانیں اور اہلیانِ مکہ و مدینہ کی شب نشینی کے واقعات کتابوں میں موجود ہیں۔ اور یہ پستی صرف کسی ایک طبقہ کے افراد تک محدود نہیں تھی بلکہ ہر طبقہ کا یہی عالم تھا۔ ایک گدائی کرنے والا فاقہ زدہ و بد بخت شاعر اور جو کر شعب جو طماعؔ (لالچی) کے نام سے مشہور تھا اس سے لے کر کوچہ و بازار میں پھرنے والے معمولی آدمی اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والے قریشی نواب زادے سبھی ایک تھالی کے چٹے بٹے تھے۔ حتیٰ کہ بعض بنی ہاشم جن کا میں یہاں نام لینا نہیں چاہتا ان کی بھی یہی حالت تھی۔ قریش کی مشہور و معروف شخصیتوں کی اولادیں کیا مرد اور کیا عورتیں عیاشوں، فاسقوں اور فاجروں کی صف میں شامل تھیں۔ اسی شخص حارث بن خالد کی گورنری کے زمانہ میں ایک دن عائشہ بنت طلحہ طواف میں مصروف تھی۔ یہ شخص اس عورت سے خاص تعلقِ خاطر رکھتا تھا۔ جب اذان کا وقت ہوا تو عائشہ نے حارث کے پاس پیغام بھجوایا کہ کہہ دو کہ جب تک میرا طواف ختم نہ ہو جائے اذان نہ دی جائے۔ حارث نے حکم دے دیا کہ عصر کی اذان نہ دی جائے۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ تم ایک شخص کے طواف کی خاطر اتنے سارے لوگوں کی نماز میں تاخیر کرنا چاہتے ہو؟ اس پر حارث نے جواب دیا : بخدا اگر کل صبح تک بھی اس کا طواف طول کھینچتا تو میں یہی کہتا کہ اذان نہ دی جائے۔

سیاسی بدعنوانیاں

اس فکری اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور عامل یہ بھی تھا کہ یہ دور سیاسی بدعنوانیوں سے بھی دوچار تھا۔ زیادہ تر بڑی بڑی شخصیتیں ایسی مادی خواہشات کی اسیر تھیں جو حکام ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی تھیں۔ ایک زمانے میں امام سجادؑ کی شاگردی میں رہنے

والے محمد بن شہاب زہری جیسی بزرگ شخصیت نے بھی خود کو اس پستی میں گرا دیا تھا کہ امامؑ کو وہ مشہور و معروف خط لکھنا پڑا جو صرف ایک خط ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کی بھی نقاب کشائی کرتا ہے کہ اس نے کس قسم کے لوگوں سے ربط و ضبط پیدا کر رکھا تھا۔ اور اس دور میں محمد بن شہاب جیسے افراد کی کمی نہیں تھی۔

علامہ مجلسی رضوان اللہ علیہ نے جو بات ابنِ ابی الحدید سے نقل کی ہے اس کو پڑھ کر انسانی ذہن کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ بحار الانوار میں پہلے تو علامہ مجلسی نے جناب جابرؓ کی زبانی امام سجادؑ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں :

"ماندری کیف نصنع بالناس' ان حدثناھم بما سمعنا من رسول اللہ ضحکوا وان سکتنا لم یسمعنا"

"اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کے ساتھ کیا کریں۔ اگر ہم انہیں رسول اللہؐ سے سنی ہوئی باتیں سناتے ہیں تو وہ انکا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر خاموش رہیں تو سنتے نہیں۔"

اس کے بعد علامہ ایک ماجرا نقل کرتے ہیں کہ امام سجادؑ لوگوں کے درمیان حدیث نقل کرتے ہیں۔ مجمع کے درمیان سے ایک شخص اٹھ کر مذاق اڑاتا ہے اور حدیث قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ واقعہ نقل کرنے کے بعد علامہ مجلسی زہری اور سعید ابن مسیب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ منحرفین میں سے تھے۔ (اگرچہ میں ذاتی طور پر سعید ابنِ مسیب کے سلسلہ میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیوں کہ دوسری دلیلوں سے ان کا امام علیہ السلام کے حواریوں میں سے ہونا ثابت ہے۔ البتہ زہری اور دوسرے بہت سے لوگوں کے سلسلہ میں یہ بات صحیح ہے) اس کے بعد خود علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ : ابنِ ابی الحدید نے ایسی بہت سے شخصیتوں اور اس دور کے سربر آوردہ حضرات کے نام ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ سب اہل بیتؑ سے منحرف تھے اور پھر آپ حضرت سجادؑ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا:

"ما بمکۃ والمدینۃ عشرون رجلا یحبوننا"

"پورے مکہ اور مدینہ میں ہمیں چاہنے والے بیس آدمی بھی نہیں ہیں"

یہ تھے وہ بد ترین حالات جن میں امام زین العابدین علیہ السلام زندگی بسر کر رہے تھے اور یہی وہ دور ہے جب آپؑ اپنے عظیم مشن کے لئے جد و جہد کا آغاز کرتے ہیں اور اسی زمانہ کی طرف امام جعفر صادق علیہ السلام ان لفظوں میں اشارہ فرماتے ہیں : "ارتدالناس بعدالحسین الا ثلاثة" امام حسینؑ کے بعد تین افراد کے علاوہ سبھی مرتد ہو گئے تھے۔ اور ان تین آدمیوں کا نام لیتے ہیں: ابو خالد الکابلی، یحیٰ ابن ام الطویل اور جبیر بن مطعم (البتہ علامہ شوستری کا خیال ہے کہ جبیر بن مطعم درست نہیں اس کے بجائے حکیم ابن جبیر مطعم ہونا چاہئے اور بعض تاریخوں میں محمد بن جبیر مطعم ہے۔ بحار الانوار کی ایک روایت میں چار افراد کا ذکر ہے اور بعض روایتوں میں پانچ اشخاص کے نام لئے گئے ہیں۔ اور یہ سب روایات ایک دوسرے کے ساتھ قابل جمع ہیں) اتنے سخت ماحول اور ایسی سنگلاخ وادی میں رہتے ہوئے امامؑ اپنے ہدف کی تکمیل کے لئے جد و جہد میں مشغول ہوتے ہیں۔

اب سید سجادؑ کا طریقہ کار کیا ہوتا؟

اپنے مقصد تک رسائی کے لئے امامؑ نے اپنے دوش پر تین ذمہ داریاں محسوس کیں۔

۱) پہلی ذمہ داری تو یہ تھی کہ امامؑ لوگوں کو معارف اسلامی کی تعلیم دیں : اگر ہم اسلامی حکومت وجود میں لانا چاہیں تو یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ عوام کے اندر دینی تعلیمات سے آشنائی پیدا نہ ہو جائے۔ بغیر اس کے اس طرح کی حکومت کی امید ہی فضول ہے۔ لہٰذا سب سے پہلا کام یہی ہے کہ لوگوں کو دینی تعلیمات سے مزین کیا جائے۔

۲) دوسری ذمہ داری یہ تھی کہ خاص طور سے مسئلہ امامت، جو ایک اجنبی اور متروک مسئلہ ہو گیا ہے۔ یا اس کو غلط معنی پہنا کر پیش کیا جانے لگا ہے اس کی حقیقت کی وضاحت کر کے لوگوں کے ذہنوں کی صفائی کی جائے، یعنی انہیں بتایا جائے کہ امامت کا کیا مفہوم ہے؟

کون امام ہو سکتا ہے؟ امام ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں؟ کیونکہ بہرحال معاشرے میں ایک قائد موجود تھا اور وہ (اس وقت) عبدالملک ابنِ مروان تھا جس کو لوگ اپنا امام تصور کرتے تھے۔ اسلامی معاشرے کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔

بعد میں ہم امام کی بحث میں عرض کریں گے کہ امامت کا وہ تصور جو ادھر چند آخری صدیوں سے ہمارے پاس موجود ہے وہ اس تصور سے قطعی مختلف ہے جو صدرِ اسلام میں رائج تھا۔ دراصل اس زمانہ میں ائمہ علیہم السلام کے موافقین و مخالفین سب اس کا وہی مفہوم لیتے تھے جو آج جمہوری اسلامی ایران میں سمجھا جا رہا ہے۔ امامِ امت، رہبرِ ملت یعنی حاکمِ دین و دنیا۔ ادھر آخری دو تین صدیوں سے ہمارا تصورِ امام کے سلسلہ میں کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ ہم سمجھ بیٹھے تھے کہ معاشرے میں ایک تو ایسا شخص ہوتا ہے جو عوام سے ٹیکس وصول کرتا ہے، انہیں محاذِ جنگ پر بھیجتا ہے، ان کو صلح کی دعوت دیتا ہے، ان کے مسائل کا ذمہ دار و نگراں ہوتا ہے، حکومتی ادارے بناتا ہے گویا حکومت کی تشکیل، اس کا نظم و نسق سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے اور اسکو حاکم کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا شخص ہوتا ہے جس کا کام یہ ہے کہ لوگوں کا دین درست کرے، ان کے عقیدے کو سدھارے، لوگوں کی نماز اور قرائت ٹھیک کرے اور اسی طرح کے دوسرے امور (اپنی ہمت و صلاحیت کے مطابق) انجام دیتا رہے اور اس کا نام عالم رکھ دیا گیا۔

امام کو بھی اپنے زمانہ میں تقریباً وہی حیثیت حاصل تھی جو بعد کی صدیوں میں عالم کی رہی ہے۔ خلیفہ اپنے کام انجام دیتا ہے، وہ بھی لوگوں کے دین اور اخلاق درست کرتا ہے۔ ادھر چند آخری صدیوں سے امام کے بارے میں ہمارا یہی تصور رہا ہے۔ جبکہ صدر اسلام میں امام کے متعلق اس سے قطعی مختلف تصور پایا جاتا تھا۔ امام کو اسلامی معاشرے کا قائد اور دین و دنیا کا حاکم سمجھا جاتا تھا۔ خلفائے بنی امیہ اسی منصب کے مدعی تھے۔ بنی عباس بھی ایسا ہی دعویٰ کرتے تھے۔ شراب کے نشہ میں چور دنیا بھر کے لہو و لعب میں ڈوبے ہونے کے باوجود اسی قسم کی امامت کے دعویدار بنے بیٹھے تھے۔ وہ خود کو امام سمجھتے تھے۔ اگر موقع ملا تو انشاء

اللہ اس بارے میں بھی گفتگو کریں گے۔

بہرحال اس وقت تو صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ اسلامی معاشرے میں امام موجود تھا' ان کا امام عبدالملک تھا۔ اور امام سجادؑ کے لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو امامت کے صحیح معنی' جہت و مقصد اور شرائط سے واقف کیا جائے۔ آپؑ کی ذمہ داری عوام کے سامنے ان چیزوں کی نشان دہی کرنا تھی جو امامت کے لئے ناگزیر ہیں' وہ چیزیں جن کے بغیر کسی شخص کا امام ہونا ممکن نہیں تھا۔ امام علیہ السلام کو ان تمام باتوں کی تشریح و توضیح کرنی تھی۔

۳) تیسری اور آخری منزل یہ تھی کہ امامؑ لوگوں کو بتائیں کہ میں امام ہوں : یعنی وہ شخص جسے اس مقام پر ہونا چاہئے' میں ہوں۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے سامنے یہ تین امور تھے جنہیں آپؑ کو انجام دینا تھا۔

امامؑ کی زیادہ تر جد و جہد پہلے مسئلہ پر مرکوز رہی۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ابھی آپؑ کے دور میں نوبت یہاں تک نہ پہنچی تھی کہ لوگ امامؑ سے "میں امام ہوں" سننے کے متحمل ہوتے۔ پہلے امامؑ کو لوگوں کے دین کی اصلاح کرنی تھی' انہیں اسلامی اخلاق سے آراستہ کرنا تھا' لوگوں کو فسق و فساد کے گڑھوں سے باہر نکالنا تھا' معاشرے میں روحانیت و معنویت (جو دین کا لب و لباب اور اصل روح ہے) دوبارہ زندہ کرنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں امامؑ کی اکثر زندگی اور کلام زہد پر مبنی ہے' تمام کا تمام زہد کی تعلیم ہے۔ حتیٰ اپنے ایک سیاسی مقصد سے متعلق گفتگو کا آغاز بھی ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

"ان علامة الز اهد ين فی الد نيا الراغبين عنها فی الاخرة۔"

"ان لوگوں کی نشانی جنھوں نے دنیا سے بے رغبتی اور آخرت سے رغبت کی۔"

یا اپنے ایک مختصر پیغام میں دنیا اور بڑے بڑوں کا دل اپنی طرف کھینچ لینے والی اسکی چکا چوند پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتے ہیں :

"اولا حر يدع هذه اللماظة لا هلها فليس لا نفسكم ثمن الا الجنة الا فلا تبيعو ها بغير ها۔"

"ہے کوئی آزاد منش مرد جو پیٹ سے الٹی ہوئی اس غذا (دنیا) کو اسکے اہل کے لئے چھوڑ دے۔ تمہارے وجود کی جنت کے سوا کوئی قیمت نہیں ' اسے اسکے سوا کسی قیمت پر نہ بیچنا۔"

امامؑ کے کلمات کا بیشتر حصہ زہد پر مشتمل ہے ' اس میں سے زیادہ تر معارف پر مبنی ہے البتہ آپؑ نے معارف کو دعا کے لباس میں پیش کیا ہے ' کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اس وقت کا گھٹن زدہ ماحول اور نامساعد حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ امام سجادؑ عوام الناس سے کھل کر صاف الفاظ میں گفتگو کر سکیں۔ نہ صرف یہ کہ حکومت کے ایجنٹ اس سلسلہ میں رکاوٹ تھے بلکہ عوام بھی اس کے لئے تیار نہ تھے۔ دراصل وہ معاشرہ ایک نالائق ' تباہ شدہ اور ناکارہ معاشرہ تھا جس کی نئے سرے سے تعمیر و اصلاح کی ضرورت تھی۔

امامؑ کی زندگی کے ۳۴ ' ۳۵ سال (۶۱ھ سے ۹۵ھ تک) اسی کوشش میں صرف ہوئے۔ البتہ دھیرے دھیرے حالات سدھر رہے تھے۔ لہٰذا امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی اسی حدیث میں جہاں یہ فرمایا تھا کہ: "ارتد الناس بعد الحسین ---" وہیں آگے بڑھ کر آپؑ یہ فرماتے ہیں : "ثم ان الناس لحقوا و کثروا" (یعنی پھر لوگ (اہل بیتؑ سے) ملحق ہوتے گئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی) اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہی حقیقت ہے۔ چنانچہ جب امام محمد باقر علیہ السلام کا زمانہ آتا ہے (جس کی تفصیل ہم بعد میں عرض کریں گے) تو حالات بدل چکے ہوتے ہیں اور یہ سید سجادؑ کی ۳۵ سال کی زحمتوں کا نتیجہ تھا۔

باصلاحیت افراد کی تیاری پر توجہ

امام سجادؑ کے کلمات میں باصلاحیت افراد کی تربیت اور اعوان و انصار کی فراہمی پر بھی خاص توجہ نظر آتی ہے۔ تحف العقول میں امامؑ کے طویل کلام کے چند فقرات نقل ہوئے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس طرح کے نمونے دوسری کتابوں میں تلاش کرنے کے لئے

وقت نہ نکال سکا۔ ویسے میرا گمان یہی ہے کہ (اس طرح کے دوسرے طویل کام) ملنا مشکل ہے اور ہوئے بھی تو زیادہ نہ ہوں گا۔ البتہ چھوٹے چھوٹے فقرے کافی مل جائیں گے۔

ایسی طویل اور مفصل حدیثیں جو تحف العقول میں امام سجادؑ سے نقل کی گئی ہیں اور جن کی تعداد دو تین تک پہنچتی ہے میرے خیال میں کہیں اور مل نہیں سکیں گی۔ ان احادیث کا لب و لہجہ اور انداز خطابت خود اس کام کی نشاندہی کرتا ہے جو امام زین العابدین علیہ السلام انجام دے رہے تھے۔ ان تین میں سے ایک حدیث یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے مخاطب عوام ہیں چنانچہ اس کا آغاز "ایھاالناس" (اے لوگو) سے ہوا ہے اور اس میں لوگوں کو معارف اسلامی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ اس مفصل حدیث میں حضرتؑ فرماتے ہیں کہ جب انسان کو قبر کے حوالے کردیا جاتا ہے تو اس سے اس کے رب کے بارے میں سوال ہوتا ہے، اس کے پیغمبر کے بارے میں سوال ہوتا ہے، اسکے دین کے بارے میں سوال ہوتا ہے، اس کے امام کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔

امام علیہ السلام کا یہ ہلکا پھلکا طرز تخاطب دراصل اپنے حلقہ تبلیغ میں آنے والے عوام کے لئے ہے۔ لیکن ایک دوسری حدیث اس سے بالکل مختلف الفاظ میں شروع ہوتی ہے جو بتاتی ہے کہ وہ خواص سے مربوط ہے۔ فرماتے ہیں :

"کفانا اللہ وایاکم کید الظالمین و بغی الحاسدین و بطش الجبارین لا یفتنکم الطواغیت"

"ظالموں کے دھوکے، حاسدوں کی جفا اور جباروں کے دبدبے سے ہمیں اور تمہیں خدا بچانے والا ہے، دیکھو طواغیت تمہیں دھوکہ نہ دے جائیں۔"

یقیناً یہ لب و لہجہ عام لوگوں سے مربوط نہیں ہو سکتا ہے، اس کے مخاطب کچھ مخصوص افراد ہیں۔

ایک تیسری قسم کا کلام بھی ہے جس کے مطالب کے بعض حصوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخصوص ترین اور انتہائی چنیدہ اشخاص سے متعلق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے مخاطب وہی افراد ہیں جو امامؑ کے اسرار و رموز اور آپؑ کی بامقصد جد و جہد سے واقفیت

رکھتے تھے اور جن کا شمار سید سجادؑ کے محرمان راز میں ہوتا تھا۔ یہاں اپنے ان ہی مخصوص دوستوں سے خطاب کرتے ہوئے امام علیہ السلام کہتے ہیں :

"ان علامۃ الزاھدین فی الدنیا الراغبین فی الاخرۃ ترکھم کل خلیط و خلیل ورفضھم کل صاحب لایرید مایریدون"

"دنیا سے بے رغبتی اور آخرت میں رغبت رکھنے والوں کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر ایسے شریک اور دوست کو ترک کردیتے ہیں اور ہر اس ساتھ چلنے والے کو چھوڑ دیتے ہیں جو وہ نہیں چاہتا جو یہ چاہتے ہیں۔"

ان تمام کلمات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امامؑ اس طویل مدت میں یا تو ادوار کے اختلاف کے لحاظ سے یا جن افراد سے آپؑ مخاطب ہوتے تھے ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے تعلیمات کے دو تین مرحلے یا انداز اپناتے تھے، کبھی اس انداز سے گفتگو کرتے تھے کبھی اس انداز سے، کبھی حکومت کی مشینری اور وقت کے طاغوتوں کے بارے میں اظہار خیال فرماتے تھے اور کبھی دین اسلام کے کلی و بنیادی مسائل بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔

یہ امام سجادؑ کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ حضرتؑ اپنی عمر کے آخری ۳۵ برسوں میں ایسے تاریک و ظلمت زدہ ماحول کے مارے ہوئے افراد کو ایک طرف تو آہستہ آہستہ حیوانی شہوات کے چنگل سے نجات دلاتے ہیں دوسری طرف ظلم و جبر کے تسلط اور دربار سے وابستہ علمائے سوء کی کمندوں سے انہیں آزادی عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر صالح اور مخلص مومنین کی ایک ایسی جماعت آمادہ و تیار کرتے ہیں جو مستقبل کی ذمہ داریوں کو اپنے دوش پر سنبھال سکے۔ البتہ امام سجادؑ کی زندگی کی جزئیات سے بحث کے لئے علیحدہ سے کئی گھنٹے درکار ہیں اور میں گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو کر بھی چکا ہوں اور اس وقت اس سے زیادہ بحث کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا عہد

اب امام محمد باقر علیہ السلام کا دور آتا ہے۔ امام محمد باقرؑ کی زندگی میں بھی ہم اسی طریقہ کار کا مشاہدہ کرتے ہیں جس پر امام سجادؑ گامزن تھے۔ اب حالات نسبتاً کچھ بہتر ہو چکے ہیں چنانچہ امام محمد باقرؑ بھی معارف اسلامی اور تعلیمات دینی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اب لوگ خاندان پیغمبرؐ کی طرف سے پہلے جیسی بے اعتنائی و سرد مہری نہیں برتتے لہٰذا جب امامؑ مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو کچھ لوگ ہمیشہ ان کے ارد گرد حلقہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور آپؑ سے مستفید ہوتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو مسجد مدینہ میں اس عالم میں دیکھا کہ خراسان کے دور دراز علاقوں اور دوسرے مقامات سے تعلق رکھنے والے افراد آپؑ کے چاروں طرف جمع تھے۔ اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ تبلیغات کا اثر اب کسی موج کی مانند پوری اسلامی دنیا میں پھیل رہا تھا اور دور دور کے لوگ اہل بیتؑ سے نزدیک ہو رہے تھے۔ ایک دوسری روایت یوں ہے : اہل خراسان آپؑ کو اپنے گھیرے میں لئے بیٹھے تھے اور حضرتؑ ان لوگوں سے حلال و حرام سے متعلق گفتگو فرما رہے تھے۔

اس وقت کے بڑے بڑے علماء آپؑ سے درس لیتے اور مستفید ہوتے تھے۔ عکرمہ جیسی مشہور و معروف شخصیت جو ابن عباس کے شاگردوں میں سے تھے جس وقت امامؑ کی خدمت میں پہنچتے ہیں تاکہ آپؑ سے حدیث سنیں (اور شاید امامؑ کا امتحان لینا بھی مقصود رہا ہو) تو ان کے ہاتھ پاؤں میں ایک تھرتھری سے پڑ جاتی ہے اور امامؑ کی آغوش میں گر پڑتے ہیں۔ بعد میں اپنی اس حالت پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عکرمہ کہتے ہیں : میں نے ابن عباس جیسے بزرگ کی خدمت میں حاضری دی ہے اور ان سے حدیث بھی سنی ہے، مگر اے فرزند رسولؐ! آپؑ کی خدمت میں پہنچ کر میری جو کیفیت ہوئی اس حالت سے میں کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں جواب میں حضرتؑ کیسے دو ٹوک الفاظ میں فرماتے ہیں :

"ویحک یا عبید اهل الشام، انک بین یدی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیها اسمہ"

''اے اہل شام (حکومت) کے بندہ بے دام! اس وقت تو ایک معنوی عظمت کے روبرو کھڑا ہے یہی وجہ ہے کہ تیرے ہاتھ پاؤں تیرے قابو میں نہیں ہیں۔''

ابو حنیفہ جیسی شخصیت جن کا اپنے دور کے صاحب نظر فقہا میں شمار ہوتا ہے' احکام دین اور معارف اسلامی کی تحصیل کے لئے امامؑ کی خدمت میں حاضری دیتی نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے بڑے بڑے علماء کے نام حضرتؑ کے شاگردوں کی طویل فہرست میں نظر آتے ہیں۔

حضرتؑ کا علمی شہرہ اطراف واکناف عالم تک پہنچ چکا تھا اسی وجہ سے آپؑ باقر العلوم کے نام سے مشہور ہوئے۔

پس آپ نے دیکھا کہ امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں معاشرے کی حالت کس قدر بدل گئی تھی اور ائمہؑ کے بارے میں لوگوں کے محبت واحترام کے جذبات میں کس قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی نسبت سے امام محمد باقرؑ کی سیاسی جدوجہد میں بھی تیزی نظر آتی ہے۔ یعنی عبدالملک بن مروان کے مقابلہ میں امام سجادؑ کا کوئی سخت اور درشت کلام اور کوئی ایسا جملہ نہیں ملتا جسے آپؑ کی طرف سے اسکی مخالفت کی علامت کہا جا سکے۔ اگر عبدالملک سید سجادؑ کو کسی موضوع پر خط لکھتا ہے اور حضرتؑ اس کا جواب دیتے ہیں تو اگرچہ فرزند نبیؐ کا جواب ہمیشہ ہر رخ سے محکم و متین اور دندان شکن ہوتا ہے پھر بھی اس خط میں اسکی کوئی صریح مخالفت اور اعتراض دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کا مسئلہ دوسرے ہی انداز کا ہے۔ آپؑ کا طرز عمل ایسا ہے کہ اس کے سامنے ہشام بن عبدالملک خوف و وحشت محسوس کرتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امامؑ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ آپؑ کو شام لے جانا چاہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید سجادؑ کو بھی آپؑ کی امامت کے دوران (حادثہ کربلا اور اسیری اہل حرم کے بعد دوبارہ) قید کر کے پابہ زنجیر شام لے جایا گیا ہے لیکن وہ دوسری نوعیت تھی اور سید سجادؑ ہمیشہ بڑا ہی محتاط طرز عمل اپناتے تھے جبکہ امام محمد باقر علیہ السلام کی گفتگو کا لہجہ سخت تر نظر آتا ہے۔ میں نے امام محمد باقرؑ کی اپنے اصحاب کے ساتھ گفتگو پر مشتمل چند

روایتیں دیکھی ہیں جن میں امامؑ حکومت اور خلافت و امامت کے لئے انہیں آمادہ کرتے ہیں حتیٰ انہیں مستقبل قریب کے لئے خوشخبری دیتے نظر آتے ہیں' ان میں سے ایک روایت بحار الانوار میں اس مضمون کے ساتھ نقل کی گئی ہے : حضرت ابی جعفر (امام محمد باقرؑ) کا در دولت لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک بوڑھا شخص عصا ٹیکتا ہوا آتا ہے اور سلام و اظہار محبت کے بعد حضرتؑ کے نزدیک بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے :

"فو اللہ انی لا حبکم و احب من یحبکم' فو اللہ ما احبکم واحب من یحبکم لطمع فی دنیا واننی لا بغض عدوکم وابرءمنه' فو اللہ ما ابغضه وابرءمنه لوتر کانت بینی و بینه واللہ انی لا حل حلالکم و احرم حرامکم و انتظر امرکم' فھل ترجولی جعلنی اللہ فداک۔"

"خدا کی قسم میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور اس کو بھی دوست رکھتا ہوں جو آپ کو دوست رکھتا ہے' اور خدا کی قسم یہ دوستی دنیاوی مفادات کی لالچ کی خاطر نہیں ہے۔ اور بے شک میں آپ کے دشمنوں سے بغض رکھتا ہوں اور ان سے برائت چاہتا ہوں' اور خدا کی قسم یہ دشمنی ان سے ذاتی عداوت یا بدلہ کے باعث نہیں ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس شئے کو حلال سمجھا ہے جس کو آپ نے حلال قرار دیا ہے اور اس کو حرام سمجھا ہے جس کو آپ نے حرام قرار دیا ہے' میں آپ کے امر کا منتظر ہوں۔ پس میں آپ پر فدا ہو جاؤں کیا میں اپنی آنکھوں سے آپ کی کامیابی کے دن دیکھ سکوں گا؟"

اس روایت میں آخری جملہ غور طلب ہے' آنے والا امامؑ سے سوال کرتا ہے : کیا آپؑ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے آپؑ کی کامیابی کے دن دیکھ سکوں گا؟ کیونکہ میں آپؑ کے امر' یعنی آپؑ کی حکومت دیکھنے کا منتظر ہوں۔ اس دور میں امر یا ھذا الامر یا امرکم کی تعبیریں حکومت کے معنی میں استعمال ہوتی تھیں۔ اس طرح کی تعبیریں کیا ائمہؑ اور ان کے اصحاب اور کیا ان کے مخالفین ہر ایک کے درمیان ان ہی معنوں میں مستعمل

تھیں۔ مثلاً مامون رشید سے گفتگو کرتے ہوئے ہارون کہتا ہے : "واللہ لو تنازعت معی فی ھذا الامر۔" (بخدا اس امر (خلافت) کے سوا ان سے ہمارا کوئی تنازع نہیں ہے۔)

ظاہر ہے کہ یہاں "ھذا الامر" سے خلافت و امامت ہی مراد ہے۔ لہٰذا مذکورہ بالا روایت میں "انتظر امر کم" کا مطلب امام کی حکومت و خلافت کا انتظار ہے۔ بہرحال وہ شخص سوال کرتا ہے کہ مولا! کیا آپؑ کو امید ہے کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا اور آپؑ کی حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا؟

امامؑ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور اپنے پہلو میں جگہ عنایت فرمائی' پھر فرمایا :

"ایھا الشیخ ان علی بن الحسین اتاہ رجل فسالہ عن مثل الذی سئلتنی عنہ"

"اے شیخ! علی بن الحسینؑ کے پاس ایک شخص آیا تھا اور اس نے بھی ان سے یہی سوال کیا تھا جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔"

البتہ مجھے سید سجادؑ سے مروی روایتوں میں یہ سوال نہیں مل سکا۔ چنانچہ اگر سید سجادؑ کے سامنے اس قسم کی گفتگو مجمع عام میں ہوئی ہوتی تو دوسرے بھی اس سے واقف ہوتے اور بات ہم تک بھی ضرور پہنچتی لہٰذا گمان غالب ہے کہ امام سجادؑ نے جو بات رازدارانہ طور پر فرمائی ہے یہاں امام محمد باقر علیہ السلام نے وہی بات علی الاعلان ارشاد فرمائی ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں :

"ان تمت ترد علیٰ رسول اللہ و علیٰ علی والحسن والحسین وعلیٰ علی بن الحسین و یثلج قلبک و یبرد فوادک و تقرعینک و تستقبل الروح و الریحان مع الکرام الکاتبین وان تعیش تری مایقر اللہ بہ عینک و تکون معنا فی السنام الاعلیٰ۔"

پس امامؑ اس صحابی کو مایوس نہیں کرتے' فرماتے ہیں : اگر موت آگئی تو پیغمبر اسلامؑ

اور اولیائے کرام کی معیت سے شرفیاب ہو گے اور اگر زندہ رہے تو ہمارے ساتھ رہو گے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے کلام میں اس طرح کی تعبیریں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امامؑ اپنے شیعوں کو مستقبل کے بارے میں پر امید رکھنا چاہتے ہیں۔ کافی میں نقل ہونے والی ایک روایت میں قیام کے لئے وقت کا تعین بھی ہوا ہے اور بظاہر یہ چیز بڑی عجیب سی لگتی ہے:

"عن ابی حمزہ الثمالی بسند عال' قال سمعت ابا جعفر (ع) یقول : یاثابت' ان اللہ تبارک و تعالیٰ قد وقت ھذا الامر فی السبعین فلما ان قتل الحسین (ع) اشتد غضب اللہ تعالیٰ علیٰ اھل الارض فاخرہ الیٰ اربعین و مائۃ و حد ثنا کم واذعتم الحدیث فکشفتم قناع الستر ولم یجعل اللہ لہ بعد ذلک وقتا عندنا و یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب۔"

"خداوند عالم نے ۷۰ھ کو حکومت علوی کی تشکیل کے لئے مقدر فرمایا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام کے قتل نے خداوند عالم کو لوگوں سے اتنا ناراض کر دیا کہ اس نے اس وقت کو ۱۴۰ھ تک ملتوی کر دیا اور پھر ہم نے تم کو اس وقت کی خبر دی اور تم نے اس کو افشاء کر دیا اور پردہ راز کو اس سے اٹھا دیا لہٰذا اب پروردگار عالم نے ہم کو اس وقت کی کوئی خبر نہیں دی ہے اور خدا کسی بھی چیز کے بارے میں جیسا چاہتا ہے محو یا اثبات کر دیتا ہے' دفتر تقدیر اسی کے پاس ہے۔"

ابو حمزہ ثمالی کہتے ہیں :

"فحدثت بذلک ابا عبداللہ (ع)' فقال : قد کان کذلک"

"میں نے امام صادقؑ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا' آپؑ نے فرمایا : ہاں ایسا ہی تھا۔"

۱۴۰ھ امام صادق علیہ السلام کی زندگی کے اواخر کا سال تھا۔ اور یہ وہی چیز ہے جو اس

حدیث مبارکہ کے دیکھنے سے قبل ہی ائمہ علیہم السلام کے حالات زندگی سے میں نے اخذ کر لی تھی۔ چنانچہ میری نظر میں وہ ممکنہ حکومت جس کے لئے امام سجادؑ نے اس انداز سے اور امام محمد باقرؑ نے اس دوسرے طریقے سے جدوجہد کی اصولی طور پر امام جعفرصادقؑ کے زمانے میں قائم ہوجانی چاہئے تھی کیونکہ امام صادقؑ کی شہادت ۱۴۸ھ میں ہوئی ہے اور خدا کی طرف سے تاسیس حکومت کا وعدہ ۱۴۰ھ کے لئے تھا اور ۱۴۰ھ کی اہمیت ۱۳۵ھ کے بعد کے دنوں کی اہمیت کے ذیل میں ہمارے پیش کئے گئے مفروضہ سے ظاہر ہے۔ یعنی یہی وہ وقت ہے جب عباسی خلیفہ منصور برسراقتدار آیا ہے۔ اگر منصور برسراقتدار نہ آتا اور بنو عباس کی حکومت نہ بنتی تو حالات یقیناً کچھ اور ہوتے۔ گویا حالات کے تحت تقدیر الٰہی یہی تھی کہ ۱۴۰ھ میں ایک الٰہی اسلامی حکومت قائم ہوجانی چاہئے تھی۔

اب یہ ایک دوسری بحث ہے کہ آیا اس آئندہ کے سلسلہ میں خود ائمہ علیہم السلام کی بھی توقعات بندھی ہوئی تھیں اور وہ اس دن کے منتظر تھے یا یہ کہ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ قضاء الٰہی کچھ اور ہی ہے؟ فی الحال ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے ممکن ہے ایک دوسرے مستقل باب میں اس پر بحث کی جائے۔ سردست ہماری بحث امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات کے سلسلہ میں ہے کہ آپؑ نے واضح الفاظ میں تصریح کی تھی کہ ۱۴۰ھ حکومت الٰہی کی تشکیل کے لئے معین تھا لیکن چونکہ ہم نے اس کی تم کو خبردے دی اور تم اس کو پردہ راز میں نہ رکھ سکے لہٰذا خداوند عالم نے اس میں تاخیر کر دی۔ اس طرح کی امید بندھانا اور وعدے کرنا امام محمد باقرؑ کے دور کا اہم امتیاز ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں گھنٹوں بحث کی ضرورت ہے تاکہ آپؑ کی زندگی کی تصویر واضح ہوسکے۔ میں اس سلسلہ میں بھی طولانی بحثیں کرچکا ہوں۔ مختصر یہ کہ حضرتؑ کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کا عنصر بالکل واضح ہے، البتہ آپؑ گرم مسلح جدوجہد کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ جب آپؑ کے بھائی زید ابن علی آپؑ سے مشورہ کرتے ہیں تو حضرتؑ انہیں قیام سے منع فرماتے ہیں اور جناب زید آپؑ کی اطاعت کرتے ہوئے خاموش ہوجاتے ہیں۔

یہ جو دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ جناب زید کی اہانت پر اتر آتے ہیں کہ امامؑ نے تو انہیں قیام سے منع کیا تھا پھر بھی جناب زید اٹھ کھڑے ہوئے اور امامؑ کی اطاعت نہیں کی' یہ ایک غلط تصور ہے۔ جب امام محمد باقر علیہ السلام نے جناب زید کو قیام سے منع فرمایا تو انہوں نے امامؑ کی اطاعت کی اور قیام نہ کیا۔ پھر جب امام صادق علیہ السلام کا دور آیا تو انہوں نے امام صادقؑ سے مشورہ کیا اور امامؑ نے نہ صرف قیام سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس سلسلہ میں ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جناب زید کی شہادت کے بعد امام صادق علیہ السلام آرزو کرتے ہیں کہ کاش میں بھی زید کے ساتھیوں میں ہوتا۔ لہٰذا جناب زید کے ساتھ یہ اہانت آمیز برتاؤ کسی طور درست نہیں ہے۔

بہرحال' امام محمد باقر علیہ السلام نے مسلحانہ قیام قبول نہ کیا لیکن آپؑ کی زندگی میں سیاسی ٹکراؤ واضح طور پر نظر آتا ہے اور اسے آپؑ کی سیرت میں سے سمجھا جا سکتا ہے جبکہ سید سجادؑ کی زندگی میں واضح سیاسی ٹکراؤ کا احساس نہیں ہوتا۔

جب اس عظیم ہستی کا دورِ حیات آخری منزلوں پر پہنچنے لگتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اپنی سیاسی جد و جہد کو میدان منیٰ میں عزاداری کے ذریعے جاری رکھتے ہیں۔ آپؑ وصیت کرتے ہیں کہ دس برس تک منیٰ میں آپؑ پر گریہ کیا جائے (تندبني النوادب بمنى عشر سنين) یہ دراصل اسی سیاسی جد و جہد کو جاری رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام پر گریہ کیا جانا اور وہ بھی منیٰ میں' آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

ائمہ علیہم السلام کی زندگانی میں عام طور پر امام حسین علیہ السلام پر گریہ کے سلسلہ میں حکم ملتا ہے چنانچہ اس ذیل میں مسلمہ روایات موجود ہیں لیکن اور کسی کے سلسلہ میں مجھے یاد نہیں کہ اس طرح کا حکم دیا گیا ہو سوائے اس کے کہ امام رضا علیہ السلام کے بارے میں اتنا ملتا ہے کہ جب آپؑ وطن سے رخصت ہونے لگے تو اپنے اہل خاندان کو جمع کیا تاکہ آپؑ پر گریہ کریں اور یہ اقدام مکمل طور پر سیاسی مقصد کا حامل ہے۔ البتہ یہ امامؑ کی رحلت سے قبل کا واقعہ ہے۔ (امام حسینؑ کے سوا) محض امام محمد باقر علیہ السلام کی شہادت کے بعد گریہ کا حکم نظر آتا ہے اور امامؑ وصیت کرتے ہیں اور اپنے مال میں سے آٹھ سو درہم دیتے ہیں

کہ ان کے ذریعہ منیٰ میں یہ عمل انجام دیا جائے۔

منیٰ عرفات و مشعر بلکہ خود مکہ سے بھی مختلف جگہ ہے۔ مکہ میں حاجی متفرق رہتے ہیں' ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے۔ عرفات کا قیام زیادہ سے زیادہ صبح سے عصر تک رہتا ہے۔ صبح لوگ تھکے ماندے پہنچتے ہیں اور عصر کے وقت واپسی کی جلدی رہتی ہے تاکہ اپنا کام انجام دے سکیں۔ مشعر میں رات کے وقت چند گھنٹوں کا قیام رہتا ہے اسکی حیثیت منیٰ جاتے ہوئے ایک گزر گاہ کی سی ہے۔ لیکن منیٰ میں مسلسل تین راتیں گزارنی ہوتی ہیں۔ ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس دوران دن میں مکہ چلے جاتے ہوں اور رات کو منیٰ لوٹ آتے ہوں۔ زیادہ تر لوگ وہیں ٹھہرتے ہیں۔ خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ وسائل سفر بھی آسانی سے مہیا نہ ہوتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد تین شبانہ روز ایک ہی جگہ جمع رہتے تھے۔ ہر شخص باسانی درک کر سکتا ہے کہ تبلیغات کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ جو پیغام بھی پورے عالم اسلام میں پہنچانا مقصود ہو وہ یہاں سے بخوبی نشر کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس دور میں جبکہ آج کی طرح ریڈیو' ٹیلی وژن' اخبارات یا اسی طرح کے دوسرے ذرائع ابلاغ موجود نہ تھے۔

جب کچھ لوگ اولاد پیغمبرؐ میں سے ایک فرد پر گریہ و زاری کرتے نظر آتے' تو لازماً وہاں موجود لوگوں کے دلوں میں سوال اٹھتا کہ ان لوگوں کی اشک ریزی کا کیا سبب ہے؟ کسی مرنے والے پر اتنی مدت تک اس شدت کے ساتھ گریہ و زاری نہیں ہوتی' کیا اس متوفی پر کوئی ظلم ہوا ہے؟ کیا اسے ظالموں نے قتل کیا ہے؟ کس نے اس پر ظلم کیا ہے؟۔۔۔ اس طرح کے بے شمار سوالات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے۔ اور یہ ایک انتہائی گہرا' سوچا سمجھا اور جچا تلا سیاسی اقدام ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور نکتہ کی طرف میری توجہ مبذول ہوئی اور وہ یہ کہ اپنی خلافت کے حق میں استدلال کا جو طریقہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں اہل بیت علیہم السلام کی زبان پر جاری رہا ہے امام محمد باقر علیہ السلام بھی

اسی کی تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے عرب ہونے کی وجہ سے عرب عجم پر فخر کرتے ہیں' آنحضرتؐ کی قربت کی وجہ سے قریش غیر قریش پر فخر کرتے ہیں ۔ اگر ان لوگوں کا فخر کرنا صحیح ہے تو ہم تو پیغمبرؐ کے خاندان اور اولاد سے ہیں لہٰذا سب پر اولویت رکھتے ہیں' اس کے باوجود ہم کو اس حق سے محروم کرکے دوسرے اپنے آپ کو پیغمبرؐ کی حکومت کا وارث قرار دیئے بیٹھے ہیں۔ اگر پیغمبرؐ کی قربت قریش کے غیر قریش پر اور عرب کے غیر عرب پر امتیاز و افتخار کی وجہ ہے تو یہ دوسروں پر ہماری برتری اور اولویت کو بھی ثابت کرتی ہے۔ یہ وہ استدلال ہے جو ابتدائی دور میں بارہا اہل بیت علیہم السلام کی زبان سے بیان ہوا ہے اور اب دوبارہ ۹۵ھ سے ۱۱۴ھ کے درمیان امام محمد باقرؑ اپنے عہد امامت میں ان کلمات کی تکرار فرماتے ہیں۔ اور اپنی خلافت کے لئے اس استدلال کو سامنے لانا بڑی معنویت رکھتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا دور

امام محمد باقر علیہ السلام کا دور بھی ختم ہوا اور ۱۱۴ھ سے امام جعفر صادقؑ کی امامت شروع ہوئی اور ۱۴۸ھ تک جاری رہی۔ امام صادقؑ نے اس مدت میں دو مرحلے طے کئے۔ ایک مرحلہ ۱۱۴ھ تا ۱۳۲ھ یا ۱۳۵ھ تک یعنی بنی عباس کے غلبہ یا منصور دوانیقی کی خلافت تک۔ اس دور کو آسودگی اور سکون کا دور کہا جا سکتا ہے اور اسی کے بارے میں معروف ہے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے درمیان نزاع و چپقلش کی وجہ سے ائمہ علیہم السلام کو شیعی تعلیمات کی تبلیغ کا موقع میسر آیا۔ اور یہ اسی دور سے مخصوص ہے' امام محمد باقر علیہ السلام کے دور میں یہ صورت نہیں تھی بلکہ وہ بنی امیہ کی طاقت و قدرت کا زمانہ تھا اور ہشام بن عبدالملک کی حکومت تھی جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ وکان ھشام رجلھم چنانچہ شاہان بنی امیہ میں عبدالملک بن مروان کے بعد ہشام بن عبدالملک طاقتور شخصیت کا مالک تھا جو امام محمد باقرؑ کے عہد میں تخت حکومت پر براجمان تھا۔ لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام

کے زمانہ میں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا اختلاف نہ تنازعہ بظاہر رونما نہیں ہوا کہ اس موقع سے امامؑ استفادہ کر سکتے۔ تمام داخلی جنگیں اور سیاسی اختلافات امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور سے مخصوص ہیں اور وہ بھی اس ابتدائی دور سے جب بنی عباس کی دعوت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے اور اسکا پھیلاؤ شروع ہوتا ہے اور دوسری طرف علوی شیعوں کی دعوت بھی پوری اسلامی دنیا میں اوج پر نظر آتی ہے۔ فی الحال یہاں ان باتوں کی تشریح کا موقع نہیں ہے۔

جس وقت امام صادق علیہ السلام مسند امامت پر متمکن ہوتے ہیں پوری اسلامی دنیا افریقہ، خراسان، فارس، ماوراء النہر الغرض مختلف اسلامی علاقوں میں باہمی جنگوں اور محاذ آرائی کا بازار گرم تھا۔ بنی امیہ کی حکومت کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی تبلیغ کے لئے وہی تین نقطے محور و مرکز قرار دیئے جن کی جانب ہم سید سجاد کی زندگی کے بارے میں گفتگو کے دوران اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی معارف اسلامی، مسئلہ امامت، نیز اس کا اہل بیت علیہم السلام سے مخصوص ہونا۔

امام صادقؑ کی حیات کے پہلے مرحلے میں خاص طور پر اس مذکورہ تیسرے عنصر کا مشاہدہ صاف طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ عمرو بن ابی المقدوم کی یہ روایت ہے کہتے ہیں: "رایت ابا عبداللہ (ع) یوم عرفۃ بالموقف و ھو ینادی باعلیٰ صوتہ" حضرتؑ عرفات میں لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر عظیم اجتماع میں باآواز بلند خطاب فرماتے ہیں اور ایک ہی جملہ کبھی اس طرف رخ کر کے اور کبھی اس طرف رخ کر کے ہر چہار طرف تین تین مرتبہ تکرار فرماتے ہیں اور وہ جملہ یہ تھا:

"ایھاالناس! ان رسول اللہ (ص) کان ھو الامام، ثم کان علی ابن ابی طالب، ثم الحسن، ثم الحسین، ثم علی ابن الحسین، ثم محمد بن علی، ثم ھہ فینادی۔ ثلاث مرات لمن بین یدیہ ولمن خلفہ و عن یمینہ و عن یسارہ اثنا عشرۃ صوتا۔"

"اے لوگو! یقیناً رسول اللہؐ امام تھے، پھر آپ کے بعد علی ابن ابی طالب، پھر حسن، پھر حسین، پھر علی ابن الحسین، پھر محمد ابن علی اور اس کے بعد "ھہ" (یعنی میں)۔۔۔ مجموعاً بارہ مرتبہ آپ نے ان جملوں کی تکرار فرمائی۔

راوی کہتا ہے : میں نے سوال کیا اس (ھہ) سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں: بنی فلاں کی لغت میں، یعنی میں۔ اس سے کنایہ خود حضرتؑ کی طرف ہے یعنی محمد بن علی علیہ السلام کے بعد میں امام ہوں۔"

اس کلمہ میں لفظ امام کا استعمال قابل توجہ ہے اور یہ اس حقیقت کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ امامؑ اس طرح عوام کے ذہن کو امامت کی حقیقت سے روشناس کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آیا وہ لوگ جو آج برسر اقتدار ہیں امامت کے سزاوار ہیں یا نہیں؟

دوسرا نمونہ یہ ہے :

"قال قدم رجل من اهل الكوفة الى خراسان فدعا الناس الىٰ ولاية جعفر بن محمد۔"

"ایک شخص مدینہ سے خراسان پہنچتا ہے اور لوگوں کو جعفر ابن محمد کی ولایت (یعنی حکومت) کی طرف دعوت دیتا ہے۔"

آپ دیکھئے ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک کے دوران وہ وقت کب آیا جب ہم کھل کر جمہوری اسلامی یا حکومت اسلامی کی بات کر سکیں؟ ہم لوگ اس پوری تحریک اور جد وجہد کے دوران برسوں تک زیادہ سے زیادہ حکومت کے سلسلہ میں اسلامی نظریات کی گفتگو کرپاتے تھے۔ یعنی بہت ہوا تو یہ کہہ دیا کہ حکومت کے بارے میں اسلام نے کیا اصول و ضوابط پیش کئے ہیں اور حاکم کو کن شرائط کا حامل ہونا چاہئے۔ بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ حکومت اسلامی کی تشکیل کی دعوت دینے یا کسی خاص شخص کا حاکم کے طور پر نام لینے کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔ ۱۹۷۸ء یا زیادہ سے زیادہ ۱۹۷۷ء میں اور وہ بھی خاص محفلوں میں ہمارے لئے ممکن ہو سکا تھا کہ اپنی جد و جہد کو حکومت اسلامی کے لئے جد و جہد کے طور پر ظاہر کر سکیں اور اس وقت بھی کسی کا اس کے حاکم کے طور پر معین اظہار

نہیں کر سکے تھے۔

ان حقائق کی روشنی میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اس دور میں لوگ اٹھتے ہیں اور مملکت اسلامی کے دور دراز علاقوں میں جا جا کر امام صادق علیہ السلام کی حکومت کی طرف عوام کو دعوت دیتے ہیں' اس کے کیا معنی ہیں؟

کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب وہ وقت قریب پہنچا جاتا ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا؟ یہ وہی ۱۴۰ھ کا سال ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو ائمہ علیہم السلام کی مسلسل جد وجہد کا فطری تقاضا ہے اور اس دور میں حکومت اسلامی کی تشکیل کی نوید دیتی ہے۔

لوگوں کو امام جعفر صادقؑ کی ولایت و حکومت کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ آج ہم ولایت کا مفہوم اچھی طرح سمجھتے ہیں' گزشتہ دور میں ولایت کے معنی محبت بتائے جاتے تھے۔ لوگوں کو امام صادقؑ کی ولایت یعنی محبت کی طرف دعوت دینا؟ محبت کے لئے دعوت نہیں ہوتی' محبت کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں جس کی معاشرے کو دعوت دی جائے۔ علاوہ ازایں اگر ولایت کا مفہوم محبت لیا جائے تو اس حدیث کے بعد کے فقرے بے معنی ہو جاتے ہیں' ملاحظہ فرمایئے۔ "ففرقۃ اطاعت و اجابت" ایک گروہ نے اطاعت کی اور قبول کیا۔ "و فرقۃ جحدت و انکرت" اور ایک گروہ نے انکار کیا اور قبول نہ کیا (اسلامی دنیا میں محبت اہل بیتؑ سے کون لوگ انکار کرتے ہیں؟!!) "و فرقۃ ورعت و وقفت" اور ایک گروہ نے ورع اختیار کرتے ہوئے خاموشی سادھ لی۔ تورع اور توقف کا بھی کسی طرح محبت کے ساتھ کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ اس بات کا قرینہ ہیں کہ ولایت سے مقصود کچھ اور ہے' ظاہر ہے وہ حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ حدیث کے آخری فقرے کچھ اس طرح ہیں: "فخرجت من کل فرقۃ رجل فدخلوا علیٰ ابی عبداللّٰہ" ہر طرف سے لوگ امامؑ کی خدمت میں آتے ہیں اور گفتگو کرتے ہیں۔ حضرتؑ ان میں سے خاموشی اختیار کرنے والے ایک شخص سے فرماتے ہیں: تم نے اس سلسلہ میں جو توقف و تورع اختیار کیا تو اس وقت یہ تورع کیوں نہ اپنایا جب فلاں نہر کے کنارے فلاں روز فلاں مخالف اسلام عمل انجام دے رہے تھے؟! یہ ارشاد بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ شخص جس نے

خراسان میں امامؑ کی ولایت کی طرف دعوت کا فریضہ انجام دیا تھا اس نے امامؑ کی رضامندی سے یہ کام انجام دیا تھا بلکہ ممکن ہے کہ خود امام علیہ السلام نے ہی اس کو اس بات پر مامور کیا ہو۔

یہ چیز امام صادق علیہ السلام کی زندگی کے پہلے مرحلہ سے تعلق رکھتی تھی اور آپؑ کی زندگی میں ایسی علامات ملتی ہیں کہ غالباً اس طرح کی تمام چیزیں اسی پہلے دور سے مربوط ہیں۔ یہاں تک کہ منصور عباسی کی خلافت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ منصور کے برسر اقتدار آتے ہی مشکلات کا دور شروع ہو جاتا ہے اور امامؑ کے لئے بھی قریب قریب وہی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی دوچار تھی۔ گھٹن چھا جاتی ہے اور طرح طرح کے دباؤ آپؑ پر پڑنے لگتے ہیں۔ حضرتؑ کو بار بار حیرہ' واسط' رمیلہ نیز دوسری جگہوں پر طلب کیا جاتا ہے یا جلاوطن کیا جاتا ہے۔ کئی مرتبہ خلیفہ آپؑ کو خطاب کرتا ہے اور سختی کا نشانہ بناتا ہے۔ ایک مرتبہ تو خلیفہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ : قتلنی اللہ ان لم اقتلک (خدا مجھے زندہ نہ رکھے اگر میں آپ کو قتل نہ کردوں)۔ ایک مرتبہ حاکم مدینہ کو حکم دیتا ہے کہ : ان احرق علیٰ جعفر بن محمد دارہ (حضرتؑ کے سمیت آپ کے گھر کو آگ لگا دو)۔ حضرتؑ جلتی ہوئی آگ عبور کرتے ہیں اور بڑے ہی توکل اور اعتماد کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں : انا ابن اعراق الثریٰ انا ابن محمد المصطفیٰ (ص)(ہم زندہ و پائندہ امام کے فرزند ہیں' محمد مصطفیؐ کے فرزند ہیں)۔

اس چیز نے دشمنوں کو اور بھی ذلیل و خوار کیا۔۔۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اور منصور کے تعلقات اکثر نہایت کشیدہ رہے۔ منصور بار بار امام کو دھمکیاں دیتا تھا۔ اگرچہ اس طرح کی روایات بھی ملتی ہیں جن میں ہے کہ امامؑ نے منصور کے سامنے اپنی ذلت اور عاجزی کا اظہار کیا (معاذ اللہ)۔ یقینی طور پر ان میں سے ایک روایت بھی درست اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ میں نے ان روایات کا جائزہ لیا اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں ہے۔ ان کا سلسلہ زیادہ

تر "ربیع حاجب" تک پہنچتا ہے جس کا فاسق ہونا قطعی اور یقینی ہے اور وہ منصور کے قریبی لوگوں میں سے ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ربیع شیعہ یا دوستدار اہل بیتؑ تھا۔ ربیع کہاں اور شیعہ ہونا کہاں؟ ربیع ابن یونس منصور کا مطیع و فرماں بردار اور حکم کا غلام تھا اور ان افراد میں سے تھا جو بچپن ہی سے بنی عباس کے نوکروں میں شامل ہو جاتے تھے۔ یہ رفتہ رفتہ منصور کا حاجب ہو گیا تھا اور بے پناہ خدمتوں کے عوض بالاخر منصب وزارت پر فائز ہو گیا تھا۔

جس وقت منصور مرا ہے، اگر ربیع نہ ہوتا تو خلافت منصور کے خاندان سے باہر چلی گئی ہوتی اور شاید اس کے چچاؤں کا خلافت پر قبضہ ہو جاتا۔ یہ ربیع ہی تھا جو مرتے وقت تنہا منصور کے سرہانے موجود تھا اور اس نے منصور کے بیٹے مہدی کے حق میں جعلی وصیت نامہ تیار کیا اور مہدی کو تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ فضل ابن ربیع جو بعد میں ہارون اور امین کے دربار میں وزارت پر فائز ہوا اسی ربیع کا بیٹا تھا۔ یہ خاندان ان خاندانوں میں سے ہے جو بنی عباس کی نمک خواری اور وفاداری میں کافی مشہور ہیں اور ان کے دلوں میں اہل بیت علیہم السلام کے لئے کسی طرح کی ارادت و محبت نہیں پائی جاتی اور ربیع نے جو کچھ امام صادق علیہ السلام کے سلسلہ میں کہا ہے وہ سراسر جھوٹ ہے اور جعلی ہے اور ان تمام کوششوں کے پس پشت اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس دور کے اسلامی معاشرے کو یہ باور کرایا جائے کہ حضرتؑ جیسی شخصیت بھی منصور کے سامنے عاجزی اور تذلل کا اظہار کر چکی ہے۔ تاکہ دوسرے لوگ اپنی حیثیت کے بارے میں خود ہی فیصلہ کر لیں۔

بہر حال منصور اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے تعلقات انتہائی کشیدہ تھے جو ۱۴۸ھ میں امامؑ کی شہادت پر منتہی ہوتے ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا عہد

امام موسیٰ ابن جعفرؑ کی زندگی کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ آپؑ کی زندگی غیر معمولی

واقعات و حادثات سے پر ہے اور میری نظر میں ائمہ علیہم السلام کی سیاسی تحریک کا نقطہ عروج آپؑ ہی کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ حضرتؑ کی زندگی سے متعلق صحیح اور واضح معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ کہیں کہیں حضرتؑ کی زندگی سے متعلق ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جو قاری کو مبہوت کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپؑ کچھ دنوں تک عمال حکومت کی نظروں سے چھپ کر پوشیدہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہارون کی پوری مشینری آپؑ کی تلاش میں رہتی ہے مگر آپؑ کا پتہ چلانے سے قاصر رہتی ہے۔ خلیفہ بعض افراد کو پکڑتا ہے اور انہیں اذیتیں دے کر آپؑ کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس چیز کی گزشتہ ائمہؑ کی زندگی میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ابن شہر آشوب مناقب میں درج ذیل روایت نقل کرتے ہیں جس سے اس قسم کا نتیجہ بر آمد ہوتا ہے : دخل موسیٰ بن جعفر بعض قری الشآم مستنکراً هارباً

موسیٰ ابن جعفر بد حالی اور فرار کی حالت میں شام کے بعض علاقوں میں آئے۔

اس طرح کی چیز کسی اور امامؑ کے بارے میں نہیں ملتی۔

اس سے امام علیہ السلام کی زندگی میں پائے جانے والے تحرک کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی کو دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آخر آپؑ کو کیوں دائمی قید کی صعوبت جھیلنی پڑی ہے۔ ورنہ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ شروع میں جب ہارون تخت خلافت پر بیٹھتا ہے اور مدینہ آتا ہے تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ نہایت ہی لطف و نوازش کا برتاؤ کرتا ہے اور انتہائی احترام سے پیش آتا ہے۔ چنانچہ یہ داستان جو مامون سے نقل کی گئی ہے بہت مشہور ہے : وہ کہتا ہے کہ حضرتؑ ایک سواری پر سوار تشریف لائے اور اس مقام پر جہاں ہارون کا پڑاؤ تھا پہنچے۔ آپؑ نے بہت چاہا کہ سواری سے اتر جائیں لیکن ہارون نے آپؑ کو ایسا نہیں کرنے دیا اور قسم دی کی آپؑ کو میری جائے نشست تک یونہی سوار ہو کر چلنا ہو گا۔ چنانچہ آپؑ اسی طرح سوار وہاں تک پہنچے۔ سب نے حضرتؑ کا احترام کیا اور آپس میں یہ یہ گفتگو ہوئی۔ جب آنحضرتؑ تشریف لے جانے لگے تو ہارون نے مجھ (مامون) سے اور امین سے کہا کہ ابوالحسن کی رکاب تھام لو۔۔۔

ایک دلچسپ بات جو اس روایت میں مامون بیان کرتا ہے وہ یہ ہے : میرے باپ ہارون نے تمام لوگوں کو پانچ پانچ ہزار اور دس دس ہزار دینار (یا درہم) عطیہ و بخشش کے طور پر دیئے اور موسیٰ ابن جعفرؑ کو دو سو دینار دیئے حالانکہ جب ہارون نے حضرتؑ سے احوال پرسی کی تھی تو حضرتؑ نے اپنی سخت پریشانی اور مالی بد حالی کے ساتھ کثرت عیال کا تذکرہ بھی کیا تھا (یہ باتیں امامؑ کی زبان سے نہایت ہی دلچسپ اور پر معنی معلوم ہوتی ہیں اور خود میں بھی اور وہ لوگ بھی جنھوں نے شاہی دور میں سیاسی سرگرمیوں کے دوران تقیہ کا تجربہ کیا ہے اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔ انہیں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام علیہ السلام کا ہارون جیسے شخص کے سامنے اس طرح اپنی پریشان حالی کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ امامؑ کیوں کہتے ہیں کہ میری حالت اچھی نہیں ہے گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے؟ اس طرح کی باتیں ہرگز ذلت و حقارت کی نشاندہی نہیں کرتیں۔ ہم اور آپ جانتے ہیں کہ جابر و ظالم وطاغوتی دور میں جان بوجھ کر ہم لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ انسان اس قسم کی سختیوں کے دور میں دشمن کو اپنی حالت اور کاموں سے غافل رکھنے کے لئے اس طرح کی باتیں کیا کرتا ہے۔)

بہرحال اصولی طور پر امامؑ کی اس طرح کی باتوں کے بعد ہارون کو امام علیہ السلام کی خدمت میں کوئی بڑی رقم مثلاً پچاس ہزار دینار (یا درہم) پیش کرنی چاہئے تھی لیکن وہ صرف دو سو دینار دیتا ہے۔

مامون کہتا ہے : میں نے اپنے باپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا : جو رقم مجھے ان کو دینی چاہئے تھی اگر دے دوں تو مجھے خدشہ ہے کہ چند دنوں کے بعد وہ اپنے دوستوں اور شیعوں میں سے ایک لاکھ شمشیر زن میرے خلاف کھڑے کر دیں گے۔

یہ ہارون کا تاثر اور خیال ہے اور میری نظر میں ہارون نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہارون کا یہ تاثر امامؑ کے متعلق چغل خوریوں کا نتیجہ ہے لیکن حقیقی قصہ یہی ہے۔ اس زمانہ میں کہ جب امامؑ ہارون کے خلاف جد و جہد میں مشغول تھے اگر واقعی اس وقت امامؑ کے پاس دولت ہوتی تو ایسے بہت سے لوگ تھے جو آپؑ کی

معیت میں تلواریں سونتنے پر آمادہ تھے اور اس کے نمونے ہمیں امام زادوں کی تحاریک میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام یقیناً اپنے گرد زیادہ افراد اکٹھا کر سکتے تھے لہٰذا امام محمد باقرؑ کا زمانہ اوج کا دور کہا جا سکتا ہے جو آپؑ کی قید پر منتہی ہوتا ہے۔

امام علی رضا علیہ السلام کا دور

جب نوبت امام رضا علیہ السلام تک پہنچتی ہے تو ایک مرتبہ پھر تشیع کے پھیلاؤ' رواج اور ائمہؑ کے اچھے حالات کا دور آتا ہے۔ شیعوں میں ہر طرف اضافہ ہوتا ہے اور بہت زیادہ مواقع میسر ہوتے ہیں جو امامؑ کی ولی عہدی پر منتہی ہوتے ہیں۔ اگرچہ جب تک ہارون بقید حیات رہا امام رضاؑ انتہائی تقیہ کے عالم میں رہے۔ یعنی آپؑ کی جد وجہد اور مساعی جاری تھی' آپؑ کی تحریک جاری تھی' لوگوں سے ربط وضبط رکھتے تھے البتہ مکمل پوشیدہ طور پر۔
انسان سمجھ سکتا ہے' مثال کے طور پر دعبل خزاعی حضرتؑ کی ولی عہدی کے دوران شاندار الفاظ میں آپؑ کی مدح سرائی کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ چیز یکایک زمین سے بر آمد نہیں ہو گئی تھی۔ وہ معاشرہ جو دعبل خزاعی اور ابراہیم ابن عباس اور ان جیسے دوسرے مداحان امامؑ پروان چڑھاتا ہو اسکی ثقافت و معاشرت میں خاندان رسولؐ کے ساتھ محبت و ارادت کا عنصر موجود ہونا ایک بدیہی سی بات ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی سابقہ کے یکایک مدینہ' خراسان' رے' نیز دوسرے علاقوں میں لوگ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا جشن منانے لگے ہوں۔ وہ واقعہ جو امام علیہ السلام کی زندگی میں پیش آیا یعنی ولی عہدی (جو ایک بڑی اہمیت کا حامل حادثہ ہے اور سال گزشتہ اپنے پیغام میں ہم نے اس کے اسباب و علل کی طرف اشارہ کیا تھا) اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہل بیتؑ کی محبت و عقیدت کے سلسلہ میں عوام کے جذبات امام رضاؑ کے دور میں بڑی بلند سطح پر پہنچ چکے تھے۔

بہرحال بعد میں جب امین اور مامون کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ سے بغداد و خراسان کے درمیان پانچ سال تک جنگ وجدال کا سلسلہ جاری رہتا ہے تو یہ صورتحال امامؑ

کے اپنے کاموں کو وسعت دینے کا موجب ہوتی ہے جو آپؑ کی ولی عہدی پر منتج ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہاں بھی امامؑ کی شہادت کی وجہ سے یہ سلسلہ قطع ہو جاتا ہے اور ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو اہل بیتؑ کے لئے آزمائشوں اور غم و آلام کا دور ہے۔ میری نظر میں امام محمد تقی جواد علیہ السلام اور آپؑ کے بعد کا دور اہل بیت علیہم السلام کے لئے ہمیشہ سے زیادہ بدتر دور رہا ہے اور اسمیں ان حضراتؑ کو سب سے زیادہ آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

یہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی کا مجموعی خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کیا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں نے اپنی گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک حصہ یہی مجموعی سیاسی خاکہ تھا جس کا اس مرحلہ پر اختتام ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ جو ائمہ علیہم السلام کی اس سیاسی جدوجہد کے نمود و اثرات سے متعلق ہے' اس پر گفتگو کے لئے اب کافی وقت نہیں رہا ہے' اور اس سے زیادہ میں آپ عزیزوں اور دوستوں کے لئے سبب زحمت نہیں بننا چاہتا لیکن وہ چیزیں جو میری نظر سے گزری ہیں اور میں نے گزشتہ دو ایک روز میں فرصت نکال کر چند گھنٹے ان پر کام کیا ہے اور اپنی پرانی یادداشتوں سے انہیں جمع کیا ہے' یہاں میں ان کے عناوین کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس سلسلے کے تمام قابل بحث عناوین صرف یہی نہیں ہیں لیکن میں صرف اس لئے چند عناوین کو پیش کر رہا ہوں تاکہ اگر دوسرے لوگ کام کرنا چاہیں تو ان کی نظروں کے سامنے یہ چند موضوعات رہیں۔

ائمہؑ کی سیاسی جدوجہد کے مظاہر و آثار

☆ ان میں سے ایک مسئلہ امامت کا دعویٰ کرنا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے۔ یہ چیز ائمہؑ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتی ہے اور ان حضراتؑ کی سیاسی جدوجہد کی غماز ہے۔ دراصل یہ ایک مبسوط فصل ہے جس کے ذیل میں مختلف ابواب کے تحت روایات

موجود ہیں۔ ان روایات میں سے کافی کی روایات الائمۃ نور اللہ۔۔۔ اور امامت کو پہچنوانے کے ذیل میں امام رضاؑ کی روایت نیز امام جعفر صادقؑ سے مروی مختلف روایات اور طرح طرح کے مخالفین سے ائمہؑ کے اصحاب کے مجادلے' اس کے علاوہ اہل عراق کو دعوت دیتے ہوئے امام حسینؑ کی روایات اور اس موضوع پر موجود بکثرت روایات۔

☆ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہؑ کی کوششوں اور دعوؤں سے خلفائے وقت کیا سمجھتے تھے۔ آپؑ نے ملاحظہ فرمایا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے لے کر متوکل عباسی کے دور تک ائمہؑ کے مقاصد اور منصوبوں کے سلسلہ میں مسلسل ایک ہی فکر و خیال پایا جاتا ہے اور ہمیشہ خلفاء اور ان کے عمال و کارندے ائمہ علیہم السلام کو ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے ہیں اور اسکے لازمی نتیجے کے طور پر ائمہؑ کے بارے میں ایک ہی انداز کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے' اسے آسانی سے نظرانداز کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔

ائمہؑ کے سلسلہ میں یہ سب اسی ایک نظریہ کے قائل کیوں تھے؟ مثال کے طور پر امام موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ خلیفتان یجبی الیہما الخراج۔۔۔ (خراج جمع کرنے والے دو خلیفہ) یا امام علی رضا علیہ السلام کے لئے یہ جملہ کہ ھذا علی ابنہ قد قعد و ادعی الامر لنفسہ (یہ علی اسکا بیٹا ہے جو اس امر کا مدعی تھا) یا دیگر ائمہؑ کے بارے میں اسی قسم کے جملے اس بات کی واضح نشاندہی کرتے ہیں کہ خلفائے وقت اور ان کے رفقائے کار ائمہؑ کے طرز عمل سے کس قسم کے دعوؤں کا استنباط کرتے تھے۔ یہ نہایت ہی قابل توجہ اور اہم ترین نکتہ ہے۔

☆ ایک اور اہم مسئلہ خلفائے وقت کا اپنی امامت پر اصرار اور شیعیان آل محمدؐ کا اس امر کی نزاکت کے پیش نظر مسلسل اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ جس کی اور بھی مثالیں موجود ہیں ملاحظہ فرمائیے : کثیر جو بنی امیہ کے پہلے دور کے صف اول کے شعراء میں سے ہے (یعنی فرزدق' جریر' اخطل' جمیل اور نصیب وغیرہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے) شیعہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے عقید تمندوں میں سے تھا۔ ایک دن امام محمد باقرؑ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے' امامؑ شکایت کے لہجہ میں اس سے سوال کرتے ہیں امتدحت

عبدالملک؟ (میں نے سنا ہے کہ تم نے عبدالملک کی مدح سرائی کی ہے؟) وہ ایک دم گھبرا کر امامؑ سے عرض کرتا ہے : یابن رسول اللہ! ماقلت لہ یا امام الھدیٰ (اے فرزند رسول! میں نے اس کو امام ہدیٰ تو نہیں کہا ہے) وانما قلت لہ اسدوالاسد کلب ویا شمس والشمس جماد ویابحر والبحر موات۔۔۔ (ہاں میں نے اس کو شیر، سورج، سمندر، پہاڑ اور اژدھا جیسے خطابات ضرور دیئے ہیں اور کسی کے لئے درندہ ہونا یا جماد سے قرار دیا جانا وغیرہ کوئی فضیلت کی بات تو نہیں ہے) اس طرح امامؑ کے سامنے کثیر اپنے عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے۔ امامؑ کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور تب شاعر آل محمدؐ کمیت اسدی اٹھتا ہے اور وہ معروف "قصیدہ ہاشمیہ" سناتا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

"من لقلب متیم مستھام　　غیر ماصبوۃ والا احلام"

یہاں تک کہ وہ اس شعر پر پہنچتا ہے :

"ساسۃ لاکمن یریٰ رعیۃ الناس　　سواء ورعیۃ الانعام"

اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام عبدالملک جیسے کی مدح سرائی کے سلسلہ میں کتنے حساس تھے اور دوسری طرف کثیر کے مثل آپؑ کے دوستوں کی حساسیت "امام الھدیٰ" پر مرکوز تھی۔ جبھی تو وہ فوراً کہتا ہے کہ مولا میں نے عبدالملک کو "امام الھدیٰ" تو نہیں کہا ہے۔ اور یہی مثال اس بات کی بھی صاف نشاندہی کرتی ہے کہ خلفائے وقت کو اپنے "امام الھدیٰ" کہے جانے کی کتنی تمنا تھی۔

چنانچہ بنی عباس کے زمانے میں یہ تمنا اور اس پر اصرار کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرلیتا ہے۔ مروان ابن ابی حفصہ اموی جو بنی امیہ اور بنی عباس دونوں ہی درباروں سے وابستہ، ان کا ملازم اور کاسہ لیس تھا۔ (یہی تو تعجب ہے کہ یہ شخص بنی امیہ کے زمانہ میں درباری شاعر تھا اور جب بنی عباس برسراقتدار آئے تو ان کا بھی درباری شاعر بن گیا!! چونکہ اس کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی لہٰذا بنی عباس نے بھی اس کو پیسوں کے ذریعہ خرید لیا) چنانچہ جب یہ بنی عباس کی مدح سرائی پر کمر باندھتا ہے تو ان کی شجاعت و کرم جیسی صفات کے بیان

پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ انہیں پیغمبر اسلامؐ سے نسبت دیتا ہے اور ان کے لئے اس مقام کو ثابت کرتا ہے جس کے وہ دیرینہ متمنی تھے۔ اسکا ایک شعر یہ ہے :

"انی یکون و لیس ذاک بکائن
لبنی البنات وراثة الاعمام"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ دختر زادے چچا کی میراث کے حقدار بن جائیں؟ پیغمبر کے چچا عباس کی میراث یہ دختر زادے (اولاد فاطمہ) نہ معلوم کیوں ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا سارا جھگڑا خلافت کے مسئلہ پر ہے اور حقیقتاً یہی سیاسی و ثقافتی جنگ رہی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مشہور و معروف شیعہ شاعر جعفر بن عفان طائی کہتا ہے :

"لم لا یکون؟ وان ذاک لکائن
لبنی البنات وراثة الاعمام
للبنت نصف کامل من ماله
والعم متروک بغیر سهام"

"بیٹی اپنے باپ کے نصف مال کی وارث ہوتی ہے اور بیٹی کی موجودگی میں چچا کا مرنے والے کے ترکہ میں کچھ بھی حق نہیں ہوتا للذا میراث میں تمہارا حق ہی کیا ہے جو طلب کر رہے ہو۔"

اس مثال سے بھی امامت کے مسئلہ میں شیعیان آل محمدؐ کی حساسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

☆ اس کے علاوہ ایک مسئلہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے خونریز تحریکوں کی تائید و حمایت ہے۔ جس کا شمار ائمہؑ کی زندگی سے متعلق گرما گرم بحثوں میں ہوتا ہے اور جو ائمہؑ کی سیاسی جد و جہد کی پالیسی کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً امام جعفر صادقؑ کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں جب معلٰی بن خنیس داؤد بن علی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں، یا اسی طرح جناب

زید شہید، حسین ابن علی شہید فخ نیز بعض دوسرے حضرات کے سلسلہ میں امام صادقؑ کے خیالات۔ میں نے "نور الثقلین" میں ایک عجیب و غریب روایت دیکھی۔ یہ روایت علی ابن عقبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں :

"ان ابی قال دخلت انا والمعلی علیٰ ابی عبداللّٰه (ع) فقال (ع) : ابشروا انتم علی احدی الحسنیین، شفی اللّٰه صدورکم، واذهب غیظ قلوبکم، وانالکم من علوکم، وهوقول اللّٰه تعالیٰ : ویشف صدور قوم مومنین، وان مضیتم قبل ان یرواذلک، مضیتم علیٰ دین اللّٰه الذی رضیه لنبیه (ص) ولعلی (ع)۔"

"میں اور معلی ابو عبداللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرتؑ نے فرمایا: تم لوگوں کو بشارت ہو کہ دو میں سے ایک نیک ترین انجام (کامیابی یا شہادت) تمہارا منتظر ہے۔ خداوند عالم نے تمہارے سینوں کو شفا دی (یا دے گا) اور تمہارے دلوں کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر دیا (یا کرے گا) اور تم کو دشمنوں پر مسلط کر دیا (یا کرے گا) اور یہی وہ وعدہ ہے جو خدا نے (مومنین سے) کیا ہے "ویشف صدور قوم مومنین" قبل اس کے کہ یہ کامیابی تمہارے قدم چومے اگر تم دنیا سے رخصت ہو جاتے (یا رخصت ہو جاؤ) تو تمہاری قربانی خدا کے اس دین کے لئے ہے (یا ہوگی) جس کو پروردگار نے اپنے نبی (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اور علی (علیہ السلام) کے لئے پسند فرمایا ہے۔"

یہ روایت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاد و مبارزہ، کامیابی و کامرانی اور قتل کرنے اور قتل کر دیئے جانے کی بات کی گئی ہے، بالخصوص اس کے مخاطب معلیٰ بن خنیس ہیں جن کے انجام سے ہم سب واقف ہیں۔ یہاں امام علیہ السلام نے بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے بات شروع کی ہے اور ظاہر ہے کہ امام علیہ السلام کسی خاص چیز یا

حادثہ سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں' جب کہ کسی کو حادثہ کا علم بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے "شفی اللہ صدور کم۔۔۔" کی عبارت امام علیہ السلام نے دعا کے طور پر ارشاد فرمائی ہو اور زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ امامؑ اس واقعہ کی خبر دے رہے ہوں جو پیش آیا ہے۔ یہ دونوں حضرات کسی مہم سے واپس آئے ہوئے تھے جس کی حضرتؑ کو خبر تھی؟ یا ہو سکتا ہے کہ خود امامؑ نے ان کو اس مہم پر مامور کیا ہو؟

حقیقت کچھ بھی ہو حدیث کا لب و لہجہ ان میں سے کسی بھی معنی و احتمال کی بنیاد پر واضح طور پر بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اس تیز و تند اور مخاصمت آمیز طریقہ کار کے حامی تھے جو معلّٰی بن خنیس کی روز مرہ زندگی میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اور یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ معلی امام صادقؑ کے "باب" ہیں اور "باب" کی تعبیر ان مباحث میں خود اپنی جگہ ایک مستقل فکر و تحقیق کا موضوع ہے۔

وہ حضرات جو روایات میں ائمہ علیہم السلام کے "باب" کے طور پر پیش کئے گئے ہیں کون لوگ ہیں؟ غالباً وہ سب کے سب یا تو مقتول ہیں یا وہ جن کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے۔ جیسے یحییٰ بن ام الطویل' معلّٰی بن خنیس' جابر بن یزید جعفی۔۔۔ وغیرہ۔

☆ ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ایک اور بحث ان کا قید خانوں میں رکھا جانا' گھر سے دربدر کیا جانا' انہیں زیر نظر رکھا جانا بھی ہے اور میری نظر میں یہ موضوع بہت زیادہ تحقیق و تدقیق کا طالب ہے کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے مطالب تحقیق و دقت نظر کے محتاج ہیں اور دامن وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ بحث کر سکوں۔

☆ ایک اور مسئلہ خلفا کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام کا بے خوف و خطر' صاف و صریح اور بے باک رویہ ہے۔ اس بحث کے ذیل میں قابل غور و فکر نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات بھی معاذاللہ دبو' مفاہمت پسند اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ہوتے تو اپنے دور کے دوسرے علما و زہاد کی طرح کسی مخالفانہ لب و لہجہ کے بجائے نرم و شیریں انداز کلام کا انتخاب کرتے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس وقت بہت سے ایسے علماء اور زہاد موجود تھے جن سے

خلفانہ صرف علاقہ' محبت بلکہ ارادت بھی رکھتے تھے۔ ہارون کہتا تھا۔

كلكم يمشي رويد كلكم يطلب صيد

غي عمرو بن عبيد

"تم میں سے ہر ایک ٹھہر ٹھہر کر چلتا ہے اور ہر ایک شکار کا طلبگار ہے سوائے عمر اور ابن عبید کے۔"

یہ لوگ خلفا کو نصائح کرتے ہیں' حتیٰ ان کی ناصحانہ باتوں پر کبھی کبھی خلفا کے آنسو بھی نکل آتے تھے البتہ وہ خلفا کو ظالم و جابر و طاغی و غاصب یا شیطان اور اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کہنے میں احتیاط برتتے تھے۔ اس کے بر خلاف ائمہ علیہم السلام ایسی کوئی رعایت نہیں کرتے تھے' حقائق کا برملا اظہار فرما دیتے تھے اور ارباب حکومت کا ظاہری جاہ و حشم اور سطوت وہیبت ان کی زبانیں بند نہ کر سکتا تھا۔

☆ ایک اور بحث ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خلفائے وقت کی معاندانہ روش ہے۔ مثال کے طور پر امام جعفر صادقؑ اور منصور نیز امام موسیٰ کاظمؑ اور ہارون کے واقعات کی جانب ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

امامت کی حکمت عملی

☆ ایک اور بحث جو پورے طور پر قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے ائمہ علیہم السلام کے بے باک دعوے ہیں جن سے امامت کی حکمت عملی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں ائمہ علیہم السلام کے ارشادات و مباحث میں اس طرح کے دعوے اور بیانات نظر آتے ہیں جو عام انداز سے بالکل مختلف ہیں اور ایک خاص مقصد و راہ عمل کو بیان کرتے ہیں جو امامت کی حکمت عملی ہے۔

ایسے ہی مواقع میں سے ایک موقع حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہ السلام اور ہارون کے درمیان فدک کے بارے میں گفتگو ہے۔

ایک روز ہارون نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا : حدفدکا حتی اردھا الیک

(فدک کی حدود معین کردیجئے تاکہ ہم اسے آپ کو واپس کردیں۔)

اسکا خیال تھا کہ اس طرح فدک کے نعرے کو بے اثر بنا دے جو تاریخ میں ہمیشہ اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت کے عنوان سے دہرایا جاتا رہا ہے اور ذریت رسولؐ سے ان کا یہ ہتھیار چھین لے اور اس طرح شاید وہ یہ بھی چاہتا ہو کہ شیعہ اس میں اور ان لوگوں میں فرق کے قائل ہوجائیں جنہوں نے اہل بیتؑ سے فدک چھینا تھا۔ حضرتؑ پہلے تو اس کی پیشکش کو رد کرتے ہیں اور جب اس کی طرف سے اصرار بڑھتا ہے تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں :

"لا آخذھا الا بحدودھا"

"اگر فدک واپس ہی کرنا ہے تو اس کی واقعی حدود کے ساتھ واپس کرو۔"

ہارون اس کو قبول کرلیتا ہے تو امامؑ فدک کی حدود معین فرمانا شروع کرتے ہیں :

"اما الحد الاول فعدن۔ اس کی پہلی حد عدن ہے"

یہ گفتگو مدینہ یا بغداد میں ہو رہی ہے۔ امامؑ جزیرہ عرب کی آخری سرحد عدن کو فدک کی ایک حد کے طور پر معین کر رہے ہیں۔

"فتغیر وجہ الرشید وقال:ایھا!"

ہارون کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے : اوہ!

حضرتؑ فرماتے ہیں :

"والحد الثانی سمرقند۔ اس کی دوسری حد سمرقند ہے۔"

(مشرق میں ہارون کی سلطنت یہیں منتہی ہوتی تھی۔)

"فاربد وجھہ۔ ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔"

امامؑ فرماتے ہیں :

"والحد الثالث افریقیہ۔ اور اس کی تیسری حد تیونس سے ملتی ہے۔"

(یہ عباسی حکومت کی مغربی سرحد ہے۔)

"فاسود وجهه وقال : هيه۔ ہارون کا چہرہ غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے : عجب؟!!

امامؑ اپنی بات جاری رکھتے ہیں :

"والحد الرابع سيف البحر مما يلي الجزر وارمينيه۔"

"اور اس کی چوتھی حد سمندر کے کناروں سے ملتی ہے جس کی پشت پر جزیرے اور ارمنستان ہیں۔"

(یہ ملک کا آخری شمالی حصہ ہے۔)

اب ہارون کا پارہ آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کھسیاہٹ اور غصہ کے عالم میں کہتا ہے :

"فلم يبق لنا شيء فتحول الى مجلسي!!

"پس (اس صورت میں) ہمارے لئے کیا رہ جاتا ہے، اٹھئے اور میری جگہ پر بیٹھ جایئے۔"

"قال موسیٰؑ: قد اعلمتك انني ان حددتها لن تردها"

"امامؑ نے فرمایا : میں نے پہلے ہی تجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے فدک کی حدیں بیان کر دیں تو تو کبھی اسے واپس نہ کرے گا۔"

اس حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں : فعند ذلك عزم على قتله۔ یعنی یہی وہ منزل تھی جب ہارون امامؑ کے قتل کا پکا ارادہ کرلیتا ہے۔

اس پوری گفتگو میں واضح ترین چیز امام علیہ السلام کا ادعا ہے، وہ بات جسے اب ہارون نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قتل پر کمربستہ ہو گیا۔ اور اسی قبیل کے اظہارات جن سے ائمہ علیہم السلام کے دعوؤں کا صاف پتہ چلتا ہے امام محمد باقرؑ امام جعفر صادقؑ اور امام علی رضاؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں، جن کو یکجا کرنے سے امامت کا موقف واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

ائمہؑ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں انکے اصحاب کا نظریہ

☆ ائمہؑ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور مسئلہ جو تحقیق اور چھان بین کے قابل ہے وہ ائمہؑ کے مقاصد، ان کے طریقۂ کار اور مدعا کے سلسلہ میں ائمہؑ کے اصحاب کا نقطۂ نظر ہے۔ اس بات کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ہمارے مقابلہ میں اصحاب ائمہؑ ان بزرگواروں سے زیادہ نزدیک بھی تھے اور ان کے مقصد و مدعا سے زیادہ واقف و آگاہ بھی۔ سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے کیا تاثرات تھے اور وہ اس کی کیا تفسیر کرتے تھے؟

کیا ہمیں روایات میں اس نکتہ کی وضاحت نہیں ملتی کہ خود اصحاب بھی قیام و خروج کے منتظر تھے؟ خراسان کے اس شخص کی داستان سے کون ناواقف ہے جو امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ کئی لاکھ مسلح افراد قیام کے لئے آپؑ کے اشارے کے منتظر ہیں۔ جب حضرتؑ مذکورہ اعداد و شمار پر تعجب فرماتے ہیں تو وہ پے در پے اعداد میں کمی کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بات کو ختم کرتے ہوئے امامؑ اپنے اصحاب و انصار کی کیفیت (Quality) پر تاکید کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح کے اتنے افراد (۱۲، ۱۵ یا ۔۔۔ افراد اختلاف روایات کے ساتھ) مجھے میسر ہوتے تو میں میدان میں آجاتا۔

اس طرح کے بہت سے افراد امامؑ کے پاس آکر قیام (روایات کے الفاظ میں خروج) کا تقاضا کرتے رہے ہیں (البتہ بعض مواقع پر امامؑ سے قیام کا مطالبہ کرنے والوں میں عباسی حکومت کے جاسوس بھی تھے جن کے جاسوس ہونے کا اندازہ امامؑ کی جانب سے ان کو دیئے جانے والے جوابات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے)

آخر یہ افراد امامؑ کی خدمت میں اس قسم کا مطالبہ لے کر کیوں حاضر ہوتے تھے؟ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس وقت شیعوں کے درمیان حق و انصاف پر مبنی حکومت کی تاسیس کے لئے قیام و خروج ایک حتمی امر اور ائمہؑ کا ایک مسلمہ مقصد سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ائمہؑ کے اصحاب و انصار اور شیعوں میں یہ بات مقبول تھی کہ امامؑ اقدام کے لئے کسی مناسب موقع کے منتظر ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ روایت میری نظر سے گزری ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زرارہ ابن اعین جیسے بلند مرتبہ صحابی میں اس امر کی مقبولیت کا کیا عالم تھا۔ رجال کشی میں روایت ہے :

ایک دن زرارہ امامؑ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص اپنی تلاش میں سرگرم دشمن کے ہاتھوں سے بھاگ نکلا ہے۔ اگر یہ "امر" (حکومت کے لئے قیام) نزدیک ہو تو وہ صبر کرے تاکہ قیام کرنے والوں کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہو تو وہ مصالحت کرلے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: وہ وقت آئے گا۔ زرارہ سوال کرتے ہیں : کیا ایک سال کے اندر ایسا ہو گا؟ امامؑ فرماتے ہیں : انشاء اللہ وہ وقت آئے گا۔" زرارہ پھر پوچھتے ہیں : کیا دو سال لگ جائیں گے؟ امامؑ وہی جملہ پھر دہرا دیتے ہیں : انشاء اللہ وہ وقت آئے گا۔ اور زرارہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ دو سال تک آل علیؑ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔"

یقیناً زرارہ' سادہ لوح و بے خبر افراد میں سے نہ تھے' وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے قریب ترین اصحاب میں سے تھے لہٰذا وہ کیسے مانتے تھے کہ علوی حکومت اتنی کم مدت بعد قائم ہو جائے گی؟

ایک دوسری روایت میں ہشام ابن سالم نقل کرتے ہیں کہ ایک روز زرارہ نے مجھ سے کہا :

"لا ترىٰ علىٰ اعوادها غير جعفر (ع)"

"مسند خلافت پر امام جعفر ابن محمد کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے۔"

ہشام کہتے ہیں : جب امام جعفر صادقؑ نے شہادت پائی تو میں نے زرارہ سے کہا: کیا تم کو اپنی وہ بات یاد ہے؟ مجھے دھڑکا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں گے۔ مگر زرارہ نے کہا : ہاں' مگر بخدا میں نے وہ بات اپنے اندازے کے مطابق کہی تھی" (مطلب یہ ہے کہ یہ شبہ نہ کیا جائے کہ زرارہ نے وہ بات امام علیہ السلام سے نقل کی تھی)

متعدد روایتیں جو قیام کے انتظار اور اصحاب ائمہؑ کی طرف سے اس کی درخواست کے بارے میں موجود ہیں ان سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا ہدف اور مقصد یعنی حکومت علوی کی تشکیل' اس کے لئے جد و جہد اور اس کا متوقع ہونا شیعیان آل محمدؐ حتیٰ ائمہؑ کے قریب ترین ساتھیوں کے درمیان مسلمات میں شمار ہوتا تھا اور یہ چیز ائمہؑ کے ہدف اور حکمت عملی کا ایک قطعی قرینہ ہے۔

☆ ایک دوسری بحث یہ ہے کہ ائمہؑ کے ساتھ خلفائے وقت کے بغض و عناد اور دشمنی و عدوات کی وجہ کیا تھی؟ آیا ان کے حسد کی وجہ ائمہؑ کی معنوی عظمت اور عوام میں ان کی ہر دل عزیزی تھی اور ان تمام دشمنیوں کا موجب اور محرک یہی چیز تھی؟ یا حقیقت امر کچھ اور ہے؟

یقیناً اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ائمہ علیہم السلام خلفا نیز اس طرح کے دوسرے افراد کے حسد کا نشانہ رہے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت ام یحسدون الناس علی ما آتاھم اللہ من فضلہ (سورہ نساء ۴۔ آیت ۵۴) کی تفسیر کے ذیل میں ائمہؑ کی ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے کہ نحن المحسودون (یعنی وہ لوگ جن سے لوگوں کا حسد کرنا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ہم لوگ ہیں۔)

البتہ یہ دیکھنا چاہئے کہ ائمہؑ کی کس چیز سے حسد کی جاتی تھی؟ کیا ان کے علم و تقویٰ سے لوگ حسد کرتے تھے؟ تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے علما و زہاد بھی موجود تھے جو ان ہی صفات کے ساتھ لوگوں میں پہچانے جاتے تھے اور ان کے چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ابو حنیفہ' ابو یوسف 'حسن بصری' سفیان ثوری' محمد بن شہاب اور اسی طرح کے دسیوں مشہور و معروف لوگ اس وقت موجود تھے جن کے مطیع و خیر خواہ بڑی تعداد میں موجود تھے اور وہ لوگوں کے درمیان مشہور اور ان کے محبوب بھی تھے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خلفا نے نہ فقط یہ کہ ان کے ساتھ بغض و حسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض خود ان خلفا کی محبت اور عقیدت کا مرکز بھی رہے ہیں۔

ہماری نظر میں ائمہؑ کے ساتھ خلفا کی ایسی شدید دشمنی جو گرفتاری' دربدری اور قید و بند

کے بعد ان کی شہادت پر منتہی ہوتی تھی اس کی اصل وجہ کسی اور ہی چیز میں تلاش کرنی چاہئے۔ اور وہ چیز ائمہؑ کا دعویٰ خلافت و امامت ہے جبکہ دوسرے یہ دعویٰ کرتے نظر نہیں آتے۔ یہ ان ہی بحثوں میں سے ایک بحث ہے جس پر تحقیق و تدقیق کئے جانے کی ضرورت ہے۔

☆ اسی طرح ائمہ علیہم السلام کے اصحاب کا حکام کے ساتھ تیز و تند مقابلہ اور ٹکراؤ بھی ایک تحقیق طلب موضوع ہے۔ جس کے نمونے ائمہؑ کی زندگی کے دوران بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔ حضرت سجادؑ کے زمانے میں جو سخت گھٹن کا دور ہے یحیٰ بن ام طویل جو حضرتؑ کے حوارئین میں سے تھے مسجد مدینہ میں آتے ہیں اور ان لوگوں سے جو یا تو دربار خلافت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے یا خلافت کے کارگزاروں میں سے تھے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی وہ آیت پڑھتے ہیں جس میں کفار سے حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو کا ذکر ہے۔ کفرنا بکم وبدابیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء۔۔۔ اور اسی طرح کناسہ کوفہ میں مجمع عام میں شیعوں کے ایک گروہ کو خطاب کرتے ہوئے باآواز بلند ایسی تقریر کرتے ہیں جس کا لفظ لفظ حکام وقت کی سیاست کے لئے کھلا چیلنج تھا۔

معلیٰ بن خنیس، نماز عید کی ادائیگی کے لئے جب لوگوں کے ہمراہ صحرا کی جانب جاتے تھے تو نہایت ہی پریشان حال، غیر مرتب لباس میں غمگین صورت نظر آتے تھے۔ اور جیسے ہی خطیب منبر پر جاتا تھا تو ہاتھوں کو بلند کر کے باآواز بلند کہتے تھے :

"اللھم ان ھذا مقام خلفائک و اصفیائک و موضع امنائک ۔۔۔۔ابتزوھا"

"پروردگار! یہ منبر اور یہ مقام تیرے منتخب اور برگزیدہ جانشینوں کا ہے جو فی الحال ان سے چھین لیا گیا ہے اور دوسروں نے اس پر اپنا پنجہ مضبوط کر لیا ہے۔"

مقام افسوس ہے کہ یہ بلند مرتبہ صحابی جس کے قاتل پر امام جعفر صادق علیہ السلام لعن و نفرین کرتے ہیں اور مقتول کی تعریف و توصیف فرماتے ہیں بعض افراد کی بے مہری کا نشانہ بنے ہیں اور وہ ان کی وثاقت میں شک کرتے ہیں۔ اور بعید نہیں ہے کہ اس فکر کے پیچھے بنی

عباس کا خبیث ہاتھ کار فرما ہو۔

☆ ایک اور مسئلہ جو کافی وسیع اور گہری بحث کا طالب ہے تقیہ کا مسئلہ ہے۔ اس عنوان کو سمجھنے کے لئے لازم ہے کہ ان تمام روایات کی چھان بین کی جائے جو کتمان' پردہ داری نیز خفیہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں' تاکہ ایک طرف تو ائمہ علیہم السلام کے اس ادعا اور ہدف کے پیش نظر جو گزشتہ مباحث میں ثابت کیا گیا ہے اور دوسری طرف خلفا کے اس شدید رد عمل کے پیش نظر جو ائمہ علیہم السلام کے اس دعویٰ اور اس سلسلے میں ان کی اور ان کے اصحاب کی سرگرمی اور سیاسی فعالیت کے خلاف ظاہر ہوتا رہا ہے' تقیہ کا صحیح اور حقیقی مفہوم سمجھا جا سکے۔

البتہ ایک چیز جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں' وہ یہ ہے کہ تقیہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے یا تمام کام اور سعی و کوشش ترک کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے کام اور جد و جہد کو پوشیدہ رکھنے کو تقیہ کہتے ہیں۔ اور یہ بات روایات پر نظر ڈالنے سے پوری طرح روشن ہو جاتی ہے۔

یہ ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ سے متعلق ضروری مباحث کا صرف ایک حصہ ہے۔ البتہ ان بزرگان دین کی سیاسی زندگی سے مربوط بہت سی دوسری بحثیں بھی ہیں جن کی فہرست پیش کرنے کی بھی اب گنجائش نہیں ہے اگرچہ ان سے متعلق ضروری نوٹس میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔ حقیر نے ان تمام موضوعات پر بڑی تفصیل کے ساتھ کام کیا ہے مگر افسوس کہ آج ان تمام چیزوں کے بیان اور ان کی جمع بندی کی فرصت نہیں رہی۔ اے کاش! ایسے باہمت افراد پیدا ہوں جو اس کام کو آگے بڑھائیں اور ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی بھی یکجا صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور ہم ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے ان روشن پہلوؤں کو اپنے لئے درس اور نمونے کے عنوان سے اختیار کریں نہ کہ صرف ایک زندہ و پائندہ یادگار کے طور پر ان کا ذکر کرنے ہی پر اکتفا کریں۔

والسلام علیکم ورحمہ اللہ۔

گراں قدر مطبوعات

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان	۲۵ روپے
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی	۱۵ روپے
ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۱۸ روپے
اسلامی علوم کا تعارف	استاد شہید مرتضیٰ مطہری	۱۵۰ روپے
امامت و رہبری	استاد شہید مرتضیٰ مطہری	۴۵ روپے
اجتہاد اور تقلید	استاد شہید مرتضیٰ مطہری	۱۵ روپے
رسول اسلامؐ روایات کی روشنی میں	علامہ محمد حسین طباطبائیؒ	۲۵ روپے
مناسک حج	آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۴۵ روپے
استفتات حج	آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۴۵ روپے
فلسفہ عزاداری	آیت اللہ سید علی خامنہ ای	۱۰ روپے
مالکیت اسلام کے نکتہ نظر سے	آیت اللہ شہید بہشتی	۲۰ روپے
اسلام کا تصور کائنات	دانشمند شہید ڈاکٹر جواد باہنر	۲۵ روپے
دین ایک تقابلی مطالعہ	دانشمند شہید ڈاکٹر جواد باہنر	۳۰ روپے
خطیب بغدادی سے دو باتیں	آیت اللہ لطف اللہ صافی	۶۰ روپے
نماز کے بارے میں ۱۱۴ نکتے	حجۃ الاسلام محسن قرائتی	۶۰ روپے
نماز شناسی نوجوانوں کے لئے	حجۃ الاسلام محسن قرائتی	۲۰ روپے
راز نماز	حجۃ الاسلام محسن قرائتی	۳۰ روپے
امامت	حجۃ الاسلام محسن قرائتی	۴۰ روپے

عدل اور سماجی انصاف	حجۃ الاسلام محسن قرائتی	۴۰ روپے
امام خمینی و اسلامی بیداری	آیت اللہ محمد علی تسخیری	۱۵ روپے
نقش پائے اہل بیت	ہاشم موسوی	۳۵ روپے
شیعہ سنی مشترک روایات (روزہ)	شیخ محمد علی تسخیری و شیخ محمود قانصوہ	۷۰ روپے
شیعہ سنی مشترک روایات (نماز جمعہ و حج)	شیخ محمد علی تسخیری و شیخ محمود قانصوہ	۶۵ روپے
عظمت حج (احادیث)		۱۰ روپے
حضرت علی ابن ابی طالبؑ (۲)	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت علی ابن ابی طالبؑ (۳)	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت امام حسنؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۳۵ روپے
حضرت امام حسینؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت امام زین العابدینؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت امام محمد باقرؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۲۷ روپے
حضرت امام جعفر صادقؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۲۷ روپے
حضرت امام موسیٰ کاظمؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت امام علی نقیؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۴۰ روپے
حضرت امام حسن عسکریؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۳۵ روپے
حضرت امام مہدیؑ	مجلس مصنفین البلاغ فاؤنڈیشن	۳۵ روپے